مولانا سیّد ابوالحسن علی صاحب کی وُہ چھ فکر انگیز تقریریں
جو اُنھوں نے مختلف موضوعات پر اپنے قیام کراچی ۲۴ تا ۲۸ مئی ۱۹۸۴ء
کے درمیان فرمائیں اور جن میں پاکستان کے ہر طبقہ کے لیے فکر و مُطالعہ،
غور و تدبُّر کا سامان اور اصلاحِ حال و خدمتِ دین و ملّت و ملک کی وُلولہ انگیز دعوت ہے

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

مجلس نشریات اسلام
۱۔ کے ۳۔ ناظم آباد مینشن ○ ناظم آباد ۱، کراچی ۱۸

سلسلۂ مطبوعات
۷۵

تحفۂ پاکستان

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی وہ چھ فکر انگیز تقریریں جو انہوں نے اپنے قیام کراچی ۲۴ ر۔ ۲۸ ر مئی ۱۹۸۴ء کے دوران فرمائیں اور جن میں پاکستان کے ہر طبقہ کے لئے فکر و مطالعہ، غور و تدبّر کا سامان اور اصلاح حال و خدمت دین و ملّت و ملک کی ولولہ انگیز دعوت ہے۔

ناشر
فضلِ ربّی ندوی

مجلسِ نشریاتِ اسلام
ا۔ کے۔ ۳، ناظم آباد مینشن، ناظم آباد ۱، کراچی ۱۸

سنہ ۱۹۸۹ء

نام کتاب ——— تحفۂ پاکستان
مصنف ——— مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
کتابت ——— بلقیس ناز
طباعت ——— شکیل پرنٹنگ پریس کراچی
صفحات ——— ۸۷
قیمت ——— ۱۲ روپے

ناشر:۔

فضلِ ربی ندوی

کتاب نما

تقاریر

اے پاکستان کے اہلِ بصیرت

اور اصحابِ غیرت

"آپ کو ہمیشہ چوکنا رہنا چاہیئے۔ پلک جھپکی اور میدانِ جنگ کا نقشہ بدل گیا، اس لئے پلک جھپکنے اور سو جانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے"

——— مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

خطاب ۲۶ رمئی ۱۹۸۴ء

عرضِ ناشر

حدیث پاکستان کے بعد محترم مرشدی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کی ان تقریروں کا مجموعہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جو حضرت مولانا نے مئی ۱۹۸۴ء میں اپنے مختصر قیام کے دوران کراچی میں کیں۔

مرشدی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات میں کئی شخصیتیں بیک وقت موجود ہیں وہ اُردو اور عربی زبان کے ایک بڑے اور اہم اہل قلم ہیں، عالم اسلام کے مسائل پر ایسی گہری نظر رکھتے ہیں کہ انہیں مفکرِ اسلام کہنا بجا ہے اور علوم دینی پر مجتہدانہ عبور رکھتے ہیں۔ عمل کے میدان میں دیکھئے تو آج عالم اسلام کا شاید ہی کوئی ایسا بین الاقوامی ادارہ ہو جس سے مولانا کی وابستگی خود اس کے لئے تقویت کا باعث نہ ہو۔ مولانا کی علمی صلاحیتوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کی روایات کو برقرار رکھنے ہی میں مدد نہیں دی بلکہ اُن روایات کو آگے بڑھایا ہے۔ شخصی زندگی میں تقویٰ کی زندہ مثال ہیں اور اُن کا یہ تقویٰ اُن کی ذات تک محدود نہیں بلکہ اُن کے وابستگانِ دامن کی زندگی کو بھی اُن کے قول و عمل کی مدد سے منور کر رہا ہے۔

حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ علی میاں میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ان کے اسلاف میں تھیں۔

علم، تقویٰ اور زبان و بیان پر قدرت نے انہیں ہمارے دور کا داعی الی الحق بنا دیا

ہے۔ شاید مجھے یوں کہنا چاہئے کہ دعوت الی الحق پر مامور کر کے حق تعالیٰ نے اس منصب کی بجا آوری کے لئے انہیں وہ زبان عطا کی ہے کہ تقریر اور تحریر دونوں کے ذریعہ وہ اپنی بات اپنے سامعین اور قارئین کے ذہن اور دل کی گہرائیوں تک پہنچا دیتے ہیں ان کی آواز ہمارے ماضی کو ہمارا مستقبل بنانے کی دعوت دیتی ہے اور ہمارے حال کو لمحۂ فکر بنا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آواز کو تادیر سلامت رکھے۔ آمین۔

آخر میں استاذ محترم قاری سید رشید الحسن صاحب خطیب جامع مسجد بنوری ٹاؤن اور اُن کے فرزند ارجمند حافظ محمد طیب صاحب سلمہٗ، کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے مرشدی علی میاں مدظلہ کے تمام خطبات کو ٹیپ کیا اور انہیں کی مدد سے ان خطابات کو کاغذ پر منتقل کرنا ممکن ہوا۔ حضرت مخدومی مولانا محمد ناظم صاحب ندوی مدظلہٗ کا بھی بے حد شکرگزار ہوں جنہوں نے اس کتاب پر مقدمہ تحریر فرما کر حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی سے اپنی دیرینہ قربت و رفاقت کا اظہار کیا ہے۔

فضل ربّی ندوی

مقدمہ

از:- مولانا محمد ناظم ندوی

صدیق مکرم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ان چھ تقریروں کے مجموعہ کا نام ہے جو انہوں نے ماہ مئی ۱۹۸۴ء کے آخری عشرہ میں کراچی کے مختلف اجتماعات میں کی تھیں۔ موتمر عالم اسلامی، فاران کلب، کراچی یونیورسٹی اور بنوری ٹاؤن کی جامع مسجد اور انجمن اشاعت قرآن کریم، کے اجتماعات میں خطاب کیا تھا۔ انہی تقریروں کو اب تحفۂ پاکستان کے نام سے طبع کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔

۱۹۷۸ء کے ماہ جون و جولائی میں بھی مولانا رابطہ العالم الاسلامی کی دعوت پر اس کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے پاکستان تشریف لائے تھے۔ اس وقت بھی مولانا موصوف نے کراچی میں مختلف اجتماعات سے خطاب کیا تھا کراچی کے علاوہ اسلام آباد، لاہور، وغیرہ میں بھی اہل علم اور علماء کرام کے اجتماعات میں مولانا نے تقریریں کی تھیں، چھ سال کے بعد مولانا کی اس سال تشریف آوری کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ عالم عرب ایک بڑے بحران سے دوچار ہے، پاکستان بھی ایک بڑے سیاسی بحران سے گزر رہا ہے اور حالات نے جو رخ اختیار کیا ہے وہ پاکستان کے بہی خواہوں کے لئے باعث تشویش و فکر ہے۔ بلاشبہ پاکستان اپنے وجود کے بعد ہی سے شدید آزمائش اور ابتلاء سے گزر رہا ہے لیکن اب جن حالات سے دوچار ہے۔ اس کی مثال آج سے پہلے کبھی نہیں ملتی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عالم اسلام میں ایک مفکر، داعی دین، مبلغ اسلام اور ایک خطیب و صاحب فکر کی حیثیت سے معروف و مشہور ہیں لہذا وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ مولانا اپنے اخلاص، ایثار، تواضع اور سلیقہ و دانشمندی سے حقائق اور نازک مسائل کو پیش کرنے میں شہرت رکھتے ہیں۔ عالم اسلام کے ایک خیر خواہ درد منداور فکر مند شخصیت کی حیثیت سے نہایت محترم ہیں۔ ان کی تقریروں، تحریروں، کتابوں، مقالوں اور کتابچوں کو قبولیت عامہ کی حیثیت حاصل ہے۔ ایسی جامع، مخلص اور سراپا ایثار شخصیت کی باتوں کا جو وزن ہو سکتا ہے اگر پاکستان میں ان کے مشوروں سے اصلاح احوال میں کچھ بھی مدد ملتی ہے تو اہل پاکستان کی خوش قسمتی ہو گی کیونکہ وہ عالم اسلام کے مایہ ناز فرزند اور مشترک علمی و دینی سرمایہ ہیں۔ ان کی سیاسی اور دینی بصیرت، عالم اسلام کے مسائل سے ان کی براہ راست واقفیت، عالم اسلام کے حکمرانوں کے مزاج سے ان کی آگاہی، مغربی جمہوریت کی افادیت اور مضرت رسانی سے وہ باخبر ہیں، عالم اسلام کے حکمرانوں کے استبداد اور امت اسلامیہ کی بے بسی اور استبداد کی چکی میں پسی ہوئی قوم کی حالت زار سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔

مولانا علی میاں کی ان تقریروں میں وقت کے تمام تقاضوں کی رعایت موجود ہے اسلامی تاریخ کے حوالہ سے نصیحت و خیر خواہی کا انہوں نے حق ادا کیا ہے۔ پاکستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر جو اہم باتیں ان تقریروں میں بیان کی گئی ہیں ان میں تین موضوع زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

امت اسلامیہ کے تاریخی دشمنوں کے کردار کا ذکر۔

(۱) ساتویں صدی ہجری کا زمانہ عالم اسلام کے لئے بڑا پرآشوب اور پرفتن اور تباہ کن عہد تھا، تاتاریوں کی یلغار اور حملوں کے سیل رواں کے مقابلہ میں عالم اسلام خس و خاشاک کی طرح زیر و زبر ہو گیا تھا ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ تاتاری حملوں سے مسلمانوں کا نام و نشان

مٹ جائے گا جس بڑے پیمانے پر بغداد، پایۂ تخت حکومت عباسیہ کی تباہی ہوئی تھی اس سے یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب مسلمان کبھی سر نہیں اٹھا سکیں گے، پورے عراق اور اس سے ملحق علاقوں کو جس طرح تاتاریوں نے تاراج کیا تھا۔ اس کا اندازہ مصلح الدین شیخ سعدی شیرازیؒ کے مرثیہ سے کیا جا سکتا ہے جو زوال خلافت عباسیہ پر خون کے آنسو کی حیثیت رکھتا ہے اس مرثیہ کا ایک دل ہلا دینے والا شعر یہ ہے۔

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین
برزوال ملک مستعصم امیر المؤمنین

یہ حکومت عباسیہ کا زوال نہ تھا بلکہ ملت اسلامیہ کا زوال تھا۔ مگر اس زوال کا سبب صرف اپنے ہی بااثر صاحب اختیار اور ذمہ دار لوگ تھے جو مار آستین اور خنجر در بغل ثابت ہوئے اور اپنے فرقہ کے چند زخم خوردہ افراد کا انتقام لینا چاہا اسلام دشمن تاتاریوں کو دعوت دے کر انتقام کی آتش فروزاں کو بجھانے کی غرض سے سازش کی گئی۔ یہ داعی کون تھے اور انتقامی کارروائی کس نے کی؟ یہ مستعصم کے وزیر ابن علقمی اور ان کے رفیق نصیر الدین طوسی تھے، لیکن تاتاریوں نے جب قتل عام کیا تو انہوں نے مسلمانوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا۔ انہوں نے کسی کو نہیں بخشا۔ خود ابن علقمی کو بھی یہ کہہ کر قتل کر دیا کہ جو اپنوں کا وفادار نہیں ہوا اور جس کا وہ نمک خوار تھا اس کا جب وہ وفادار نہ ہوا تو ہمارا وفادار کس طرح ہو سکتا ہے؟ زوال حکومت عباسیہ مسلمانوں کی تاریخ کا ناقابل فراموش عبرت ناک سانحہ بلکہ المیہ ہے۔

یہ تو ساتویں صدی ہجری کی بات ہے۔ برصغیر پاک و ہند پر جب ابتداً انگریزوں نے قبضہ کرنے کی تدبیریں کیں اور نوابوں اور حکمرانوں کو یکے بعد دیگرے اپنا غلام بنانا شروع کیا تو اس وقت بھی اپنی ہی صفوں میں سے غداروں نے انگریزوں کی تائید کی، جعفر و صادق کی غداری ہماری زبان میں بے وفائی اور غداری کے لئے ضرب المثل بن

گئی ہے اقبال کا ایک لازوال شعر زبان زد بن گیا ہے۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دین، ننگ وطن

ان دونوں کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان جن سنگین حالات سے گزر رہا ہے اس کا تقاضہ ہے کہ مولانا علی میاں نے جو تاریخ کے حوالہ سے بات کہی ہے اس کو ہمارے عوام و خواص اور ہمارے حکمران اچھی طرح سمجھیں، ہماری اپنی صفوں میں مکمل اتحاد و یگانگت ہونی چاہیئے، ملک کے غدّاروں اور بے وفاؤں سے ہوشیار رہنا چاہیئے، المؤمن لا یلدغ من جُحرٍ واحدٍ مرتین، (حدیثِ نبوی) مردِ مومن ایک بِل سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔ فتنۂ تاتار کا عہدِ ماضی میں جو مرکز تھا آج بھی غدّاروں کا وہی قبلہ و مرکز ہے اگر وہی نہیں تو اس سے قریب تر ہے، جن کی وفاداریاں ہمیشہ اپنے ملک سے باہر اپنے ہی مرکز ایمان و یقین سے وابستہ ہیں ان سے چوکنّا رہنا تقاضائے دانشمندی و ہوشمندی ہے۔

(۲) مولانا کی تقریر کا دوسرا اہم موضوع :۔ پاکستان کا اسلامی تشخص ہے جو نہ صرف باقی رہنا چاہیئے بلکہ اسے مزید اجاگر ہونا چاہیئے۔ پاکستان کے قیام میں برصغیر کے عوام و خواص، علماء و مشائخ اور سیاست داں الغرض سب ہی کا حصّہ ہے۔ یہ نہ صرف آج کے پاکستان میں آباد مسلمانوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے بلکہ اس برصغیر کے مسلمانوں کے دینی شعور، ایک علیحدہ ملت ہونے پر اذعان و یقین کا مظہر ہے، اپنی مخصوص ثقافت اور اپنے تمدن و تہذیب کی حفاظت کے لئے اجتماعی سعی کا نتیجہ ہے یقیناً ہندوستان کے مسلمانوں کے حصہ میں صرف قربانی آئی اور آج بھی وہ ماضی کی اس جدوجہد کی قیمت ادا کر رہے ہیں، پاکستان میں آباد ہونے والے مسلمانوں نے تو بہت کچھ اس کا پھل بھی کھایا اور کھا رہے ہیں مگر ان کے بھائی مسلسل اس کی قیمت ادا کر رہے ہیں، ان تمام عظیم قربانیوں کا تقاضا ہے کہ پاکستان کا اسلامی تشخص برقرار رہے۔

مولانا نے بالکل صحیح کہا ہے کہ جس عظیم مقصد کی خاطر یہ ملک قائم کیا گیا ہے اس مقصد کو نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہونا چاہیئے ، یہ ملک برصغیر کے مسلمانوں کا مشترک سرمایہ ہے یقیناً دینی عقائد، اسلامی اخلاق، اسلامی کردار، اسلامی تہذیب وتمدن کا فروغ ہونا چاہیئے زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی چھاپ کو باقی رکھنا اس مقصد کے اجزار ترکیبی ہیں۔

برصغیر کی تاریخ میں متعدد حکمراں خانوادوں کا ذکر ملتا ہے ، غلاموں، خلجیوں، تغلقوں اور اخیر میں مغلوں کا دور آتا ہے۔ مولانا نے بجا کہا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی میں، ان کے معاشرہ میں اسلامی رنگ غالب تھا ، ان کا اسلامی تشخص برقرار تھا محفوظ تھا، ان کے عقیدہ وکردار میں اسلامی تعلیمات کے اثرات ہمیشہ موجود رہے لہٰذا مختلف حکمران خانوادوں کے آنے جانے کا مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا تھا اور ہر حکمران خاندان مسلمانوں کی ملی زندگی اور اس کے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کی فکر رکھتا تھا کیونکہ مسلمانوں کے اسلامی وملی تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے علمار صوفیہ اور مشائخ کام کرتے تھے آج بھی علمار کرام ، مشائخ عظام صاحب نظر سیاست داں حضرات کا فرض ہے کہ وہ آپس کے تمام اختلافات کو فراموش کر کے ملت اسلامیہ کے اسلامی وملی تشخص کو برقرار رکھیں۔ سیاسی، مذہبی اور فروعی اختلاف کو اتنی اہمیت نہیں دی جائے کہ ملک وملت کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہوجائے علمار ومدرسین کو اپنے فروعی اختلافات کو اپنی درسگاہوں سے باہر بیان کر کے قوم کو پراگندہ اور منتشر کرنا زیب نہیں دیتا۔ انہیں واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولا تفرقوا" پر عمل کرنا چاہیئے۔

مولانا نے اپنی ایک تقریر میں فاتح مصر (سنہ ۲۰ھ) عمرو بن العاص کی تقریر کا ایک تاریخی فقرہ نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنی فاتح فوج کو مخاطب کر کے کہا تھا جس ایک فقرہ میں مضمون ادا کیا تھا وہ یہ ہے کہ تم فتح کے بعد یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا کام ختم ہوگیا ہے اور اب

سکون واطمینان کی زندگی گزارنے اور عیش وآرام کرنے کا وقت آگیا ہے تم ایک مسلسل اور دائمی نگرانی کا فرض انجام دینے والی قوم ہو۔ سرحد کی نگرانی اور حفاظت کا کام کبھی عارضی اور وقتی نہیں ہوتا۔ یہ ایک مسلسل دائمی فریضہ ہے جس کی طرف سے کبھی غفلت نہیں برتی جاسکتی۔ "انکم فی رباطٍ دائم" تم ایک دائمی سرحد کی حفاظت ونگرانی کرنے والی چوکس قوم ہو لوگوں کے دل تمہاری طرف دیکھتے ہیں کہ تم کس قدر چوکنا، بیدار اور فرض شناس ہو۔

یہ فقرہ نقل کرکے مولانا نے پاکستانی قوم کو اس کا ایک اہم فریضہ یاد دلایا ہے یہ کام صرف سرحد کی فوجوں کا نہیں ہے، یہ سب کو معلوم ہے کہ سرحد کے ساتھ ملک کا چپہ چپہ سرحد کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے چپہ چپہ کی اس کے نظریات کی اس کے ملی تشخص کی حفاظت کی ذمہ داری ملک کے تمام باشندوں پر یکساں ہے۔

(۳) باہر سے آنے والوں بلکہ ملک کے اندر آباد صاحب نظر حضرات کو بھی پاکستان کا ایک معاشرتی پہلو کھٹکتا ہے، وہ مسلمانوں کے رہن سہن میں اسراف وبے جا مصرف کا پہلو ہے زندگی کے تمام شعبوں میں بلند معیار قائم کرنے کے لئے جنون کے حد تک مسابقت کا جذبہ ہے۔ عالیشان بنگلوں، کوٹھیوں اور محل تعمیر کرنے کا ذوق بے پایاں ہے، شادی بیاہ میں رسوم کی پابندی اور بے انتہا فضول خرچی کا عنصر ہے حق یہ ہے کہ پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں خصوصاً کراچی اور لاہور جیسے بڑے شہروں میں معیار زندگی کی بلندی، قالینوں، غالیچوں، صوفوں اور اعلیٰ درجہ کی کرسیوں کا استعمال اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ عظمت اور بُرائی کا معیار، اخلاق، کردار، راست بازی، حسن معاملہ نہیں رہا ہے بلکہ زندگی کے بیرونی مظاہر کی چمک دمک اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والی اشیاء نمود کی فراوانی ہے۔

ایران کو عہد فاروقی میں جب عربوں نے فتح کیا تھا اس وقت ایران کے حکمرانوں،

روساء و امرائے طبقہ کی مسرفانہ زندگی کا جو نقشہ عرب مورخین نے کھینچا ہے اس کو پڑھ کر انسان حیران ہو جاتا ہے کہ ایک آدمی جب تعیشات کا ایسا غلام اور پابند ہو جاتا ہے تو میدان جنگ کی سختیوں کو کس طرح برداشت کر سکتا ہے۔ تعیش و تن آسانی کی زندگی آدمی کو کمزور، پست ہمت اور بزدل بنا دیتی ہے، زوال اندلس میں جہاں آپس کی عصبیتوں کو، عدنانیوں اور قحطانیوں، نزاریوں اور مضریوں اور پھر عرب اور بربر قبائل کی نسلی کشمکش و آویزش کو دخل تھا وہاں ذوق تعمیر کے عروج کو بھی دخل تھا۔ محلات اور اعلیٰ درجہ کے بنگلوں، کوٹھیوں اور مدینۃ الزہرا، اور قصر حمرا کے ذوق تعمیر کو بھی دخل تھا۔ اور اقبال کا یہ شعر صادق آرہا تھا ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

لیکن پاکستان میں تو طاؤس و رباب ہی سے آغاز ہو رہا ہے۔ اندلس کے مسلمانوں کی زندگی سے سادگی رخصت ہو چکی تھی اور ایک مائل بزوال تمدن کے آغوش میں زندگی کی آخری سانس لے رہے تھے۔

مولانا نے نہایت بلیغ و مؤثر انداز میں اندلس کی تباہی و بربادی کے چند اسباب میں سے عربوں کی مسرفانہ زندگی اور ذوق تعمیر کا ذکر کیا ہے تاکہ اہل پاکستان اس سے عبرت حاصل کریں۔

اسی مسرفانہ پُر تعیش زندگی کے اثرات میں سے ایک بُری بات یہ پیدا ہو گئی ہے کہ امارت و غربت کے فاصلے رشتہ داروں کے درمیان حائل ہوتے جا رہے ہیں۔ خوشحال افراد اپنے غریب رشتہ داروں سے ملنے میں عار محسوس کرتے ہیں اور کم خوشحال خاندان اپنے سے زیادہ خوشحال خاندان سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ کچھ اپنے آپ کو محسود تصور کرتے ہیں کچھ لوگ انہیں غرور دولت اور تکبر امارت میں مبتلا ہونے کا طعنہ دیتے ہیں، اس طرح خاندانوں کے درمیان بعد پیدا ہوتا جا رہا ہے، یہ ایک بُری علامت

ہے جو ایک نہایت ہولناک انجام کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مولانا نے اپنی تقریریں ان امور کی طرف بڑے لطیف اشارے کئے ہیں، مولانا نے اپنی چھ تقریروں میں اسلام اور تاریخ کے حوالہ سے بڑی نصیحت آموز باتیں کہی ہیں بلاشبہ مولانا کی تقریروں سے صاف ظاہر ہے جو ایک بدیہی حقیقت بھی ہے کہ انفرادی سعی کے بجائے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے۔

مجھے امید ہے کہ مولانا کی یہ تقریریں جس طرح ذوق وشوق سے سنی گئی تھیں طبع ہونے کے بعد اسی ذوق وشوق اور استفادہ کی غرض سے پڑھی جائیں گی۔

مجھے مسرت ہے کہ ایک رفیق قدیم اور محب صمیم کی خواہش کے مطابق اس گلدستۂ مضامین پر جس کا نام تحفۂ پاکستان ہے چند سطور لکھنے کی مجھے سعادت حاصل ہوئی۔ مجھے مسرت کے ساتھ شرف تحریر کا بھی احساس ہے کہ ایک قدیم رفیق جو ندوۃ العلماء ہی کا نہیں بلکہ عالم اسلام کا گل سرسبز ہے اس کے مضامین کے مجموعہ پر چند سطور لکھنے کا موقع ملا، بلبل را ہمیں بس است کہ او قافیۂ گل است۔

محمد ناظم ندوی (سابق شیخ الجامعہ بہاولپور)
۱۵ ارمحرم الحرام ۱۴۰۵ھ
۱۱ را کتوبر ۱۹۸۴ء
بیت ناظم، درخشاں، ملیر ہالٹ۔ کراچی ۳۷

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ملک و قوم کی سطح پر اسلامی معاشرہ کی ضرورت

(یہ تقریر خطبہ جمعہ سے پہلے ۲۵ مئی ۱۹۸۴ء کو جامع مسجد بنوری ٹاؤن میں کی گئی)

اَعُوْذُ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ وکذٰلک جعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا[۱]"

اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو۔

میرے بھائیو اور دوستو! آپ کو معلوم ہے کہ جب چھٹی صدی مسیحی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ اس وقت دنیا سے ایمان و عقیدہ، اعمال حسنہ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت یکسر و کلیتہً مفقود نہیں ہوئی تھی، کہیں کہیں اس کے آثار پائے جاتے تھے، ایسے افراد موجود تھے جو اپنی اپنی جگہ پر صحیح عقیدہ بھی رکھتے تھے اور عمل بھی کرتے تھے، خود اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں یہودیوں کے متعلق فرماتا ہے:

لیسوا سواء من اھل الکتاب	یہ سبھی ایک جیسے نہیں ہیں ان اہل کتاب میں کچھ
امۃ قائمۃ یتلون اٰیات اللہ	لوگ (اللہ کے حکم) قائم بھی ہیں جو رات کے وقت
اٰناء اللیل وھم یسجدون ٥	اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں اور (اس کے آگے) سجدے
یؤمنون باللہ والیوم الاٰخر	کرتے ہیں اور اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے
ویأمرون بالمعروف وینھون	اور اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور بری باتوں سے

[۱] سورۃ البقرۃ: ۱۴۳

عن المنکر و یسارعون فی الخیرات   منع کرتے اور نیکیوں پر لپکتے ہیں اور یہی لوگ
واولئک من الصالحین[1] ○   نیکوکار ہیں۔

دنیا ایمان وعقیدہ، عمل صالح اور اللہ کی معرفت سے (ان کمزوریوں کے ساتھ جو امتدادِ زمانہ اور عہدِ نبوت سے بُعد و فاصلہ سے ان میں پیدا ہوگئی تھیں) بالکل خالی نہیں ہوگئی تھی۔ خواہشاتِ نفس اور ماحول کے فساد سے جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں وہ پورے معاشرہ کی پوری زندگی پر حاوی ہوگئی تھیں اور جو فاسد و ظالم نظام و ماحول قائم ہوگیا تھا اس کا اثر ضرور پڑا تھا، مگر اچھے لوگ موجود تھے۔ ان افراد کی مثال ایسی تھی جیسے برسات کی اندھیری رات میں جگنو چمکتا ہے۔ یہاں سے اُڑ کر اُدھر چلا گیا، اُدھر سے اُڑ کر ادھر آگیا۔ نہ مسافر کو اس سے راستہ مل سکتا ہے اور نہ کوئی اس کی روشنی میں اپنا کام کرسکتا ہے کہ کچھ سی پرولے یا حشرات الارض کو پہچان لے، راستہ کے نشیب و فراز دیکھ لے اور ٹھوکر نہ کھائے۔ وہ روشنی ایسی نہیں ہوتی۔ جاہلیت کی شبِ ظلمت میں ان افراد کے نورِ ایمانی کی جو ان کے قلب کے اندر تھا، حقیقت اس سے زیادہ نہیں تھی جتنی برسات کی اندھیری رات میں کہیں کہیں جگنو کی چمک نظر آتی ہے، اس جگنو کی روشنی سے کوئی اپنا دیا جلا نہیں سکتا۔ اس وقت ان افراد کی حالت ایسی ہی تھی۔ وہ افراد کہیں کم تھے کہیں زیادہ تھے نسلِ انسانی کی بدقسمتی یہ نہیں تھی کہ اچھے افراد نہیں تھے، افراد تھے، لیکن افراد اس صورتِ حال میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں پیدا کرسکتے تھے، وہ افراد منتشر تھے، کمزور تھے ان افراد کے اندر دعوت کا جذبہ نہیں تھا، حالات سے جو بےچینی ہونی چاہئے کہ آدمی کی روح سلگتی رہے، اور اس کا دل جلتا رہے، اس کی آنکھیں اشکبار رہیں اور اس کو کسی کل چین نہ آئے، ان افراد کی حالت یہ بھی نہیں تھی، وہ افراد یا تو اصلاح سے مایوس ہوگئے تھے اور اپنی خیر مناتے تھے کہ ہمارا ہی ایمان محفوظ رہ جائے، جیسا کہ حضرت

---

[1] سورۂ آلِ عمران: ۱۱۴

سلمان فارسیؓ نے اپنی طلب ہدایت کی سرگزشت میں بیان کیا ہے، کہیں کسی کلیسا میں بیٹھا ہوا کوئی آدمی ملتا، کہیں کسی خانقاہ میں پناہ گزیں کوئی اللہ کا نام لینے والا ملتا، لیکن دنیا جس روش پر جا رہی تھی، اس روش کی تیزی کو کم کرنے کے لئے بھی (رخ تبدیل کرنا تو بہت بڑی چیز ہے یہ تو اولوالعزم پیغمبروں ہی کا کام ہے) یہ افراد کچھ موثر و مفید نہیں تھے، جس رفتار کے ساتھ دنیا ہلاکت کے خندق کی طرف جا رہی تھی اس میں تھوڑا سا سکون پیدا کرنے اور بریک لگانے کی طاقت بھی کسی میں نہیں تھی۔

اس دنیا کی بدقسمتی یہ نہیں تھی کہ سرے سے کہیں اللہ کا نام لینے والا کوئی نہیں تھا، اللہ کے سامنے سر جھکانے والا کوئی نہیں تھا۔ ایسا نہیں تھا، دنیا کی بدقسمتی اور عالم انسانی کا سب سے بڑا یہ خلا تھا کہ صحیح اعتقاد اور اس اعتقاد کے مطابق عمل کرنے کا عزم و جذبہ، انسانی سیرت و اخلاق کی بلندی اور عملی نمونہ قوموں کی سطح پر، ملکوں کی سطح پر اور عالمگیر دعوت کی سطح پر نہیں تھا، افراد تھے مگر معاشرہ نہیں تھا، شہروں میں ایک دو گھر محفوظ تھے مگر پاکیزہ ماحول اور سوسائٹی نہیں تھی۔ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ ایک پورا معاشرہ ایک مکمل اور وسیع ماحول قائم ہو۔ ایک صاحب اقتدار موثر قوم صحیح عقیدہ، صحیح عمل، صحیح اخلاق اور صحیح طرز زندگی کی داعی اور اس کا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آئے۔ اس دنیا کی یہی بدقسمتی تھی جس کی وجہ سے ہدایت کا کام چل نہیں رہا تھا، انسانیت معطل اور مفلوج ہو کر رہ گئی تھی، اس پر فالج کا ایسا حملہ ہوا تھا کہ جو لوگ غلط کو غلط سمجھتے تھے اور صحیح کو صحیح سمجھتے تھے وہ انسانیت کے مستقبل سے بالکل مایوس ہو گئے تھے اور کسی پہاڑ کی چوٹی پر یا کسی غار کی گہرائی میں اپنا ایمان اپنے سینے سے لگائے ہوئے اور اس چراغ ہدایت کو دامن کے نیچے لئے ہوئے کہ ہوا کا کوئی تیز جھونکا اس شمع کو بجھا نہ دے، جیسے اس نے قوموں کے چراغ بجھا دیئے ملکوں کے چراغ گل کر دیئے (وہ ڈرتے تھے کہ) ہمارے چراغ

ہدایت کو بھی ہوا کا کوئی جھونکا گل نہ کردے۔ فرشتوں کو تخلیق آدم پر بڑا اعتراض تھا، وہ کہتے تھے "اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء" (کیا تو زمین میں ایسے کو رکھنے والا ہے جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا) اس اعتراض کا جواب دینے اور انسان کی ضرورت اور افادیت ثابت کرنے کے لئے دنیا میں کوئی کوشش نہیں ہو رہی تھی۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فرمائی اور آپکی بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت فرمائی۔ بہت سے لوگوں کیلئے یہ تعبیر بھی شاید نئی ہو اور شاید کچھ الجھن پیدا کرنیوالی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت "بعثت مقرونہ" تھی جیسا کہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی ؒ نے "حجۃ اللہ البالغۃ" میں لکھا ہے کہ بعثت کی دو قسمیں ہیں ایک اکہری بعثت (بعثت واحدۃ) نبی کی بعثت، دوسری "بعثت مقرونہ" یعنی نبی کی بعثت کے ساتھ ایک امت کی بعثت، تو آپ کی بعثت کے ساتھ ایک پوری امت مبعوث کی گئی، اس لئے کہ دنیا کی گمراہی، دنیا کی خودکشی کرنے کا جذبہ اور اس کا عزم و فیصلہ اس حد تک پہنچ گیا تھا اور دنیا کا مستقبل خطرہ سے اتنا دوچار تھا کہ افراد کی سعی اس صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتی تھی، اس کے لئے اللہ تبارک تعالیٰ نے ایک طرف تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، دوسری طرف ایک پوری امت کو مبعوث فرمایا، اس کے لئے قرآن مجید میں جو الفاظ آئے ہیں ان کی بعثت ہی سے تعبیر کی جا سکتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وکذلک جعلنٰکم اُمۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس[1]۔	اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔
کنتم خیر امۃ اخرجت للناس	مومنو! جتنی امتیں یعنی قومیں لوگوں میں پیدا ہوئیں

[1] البقرۃ: ۱۴۳

امرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ○[1]	تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

"اخرجت للناس" کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ امت کوئی سبزہ خودرو نہیں تھی جیسے جنگل کی گھاس ہوتی ہے، یا جنگلی درخت ہوتے ہیں کہ اُگ آئے، نہیں بلکہ "اخرجت للناس" مجہول کا صیغہ استعمال کیا گیا اور اس کی نسبت اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف ہے۔ خروج اور اخراج میں فرق ہے۔ خروج اپنا ذاتی فعل ہے، انفرادی فعل ہے اور اخراج کسی دوسری طاقت بالا اور ہستی کا فعل ہے۔

چونکہ اللہ تبارک تعالیٰ کو نبوت و رسالت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کرنا تھا اور قیامت تک کے لئے آپ کے دین کو قائم رکھنا تھا، اسلئے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی گاڑی کو چلانے کے لئے اور اس کے چلتے رہنے کے لئے یہ انتظام کیا کہ آپ کے ساتھ ایک پوری امت کی بعثت فرمائی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ اس حقیقت کو جانتے تھے اور اپنے لئے اسی قسم کے الفاظ استعمال کرتے تھے، چنانچہ جب رستم نے حضرت ربعی ابن عامر سے پوچھا کہ "ما الذی جاء بکم؟" (تمہیں کونسی چیز یہاں لائی) تم اپنے صحرا سے نکل کر یہاں کیوں آئے، اس کا محرک کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا: "اللہ ابتعثنا" اللہ نے ہم کو بھیجا ہے، تاکہ ہم لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی غلامی اور اللہ کی بندگی میں داخل کریں اور دنیا کی تنگی سے ان کو نکال کر کونین کی بے کراں وسعتوں سے آشنا کریں اور مذاہب کی ناانصافی سے نکال کر اسلام کے انصاف کے مزہ سے آشنا کرائیں۔ اسی لئے انہوں نے اس موقع پر "ابتعثنا" کا لفظ استعمال کیا۔

---

[1] آل عمران : ۱۱۰

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہر دور میں دنیا کے لئے ضرورت رہی ہے ک
مکمل معاشرہ ایک ملت اور ایک عالمگیر دعوت کی سطح پر اسلامی زندگی پائی جائے
کہنا کافی اور مفید نہیں کہ صاحب کتابوں کے اندر پورا اسلام موجود ہے، دیکھ لیجئے
لیجئے! یا آپ کہیں کہ اگر آپ کو معلوم کرنا ہو کہ اللہ شناسی کیا ہوتی ہے، اللہ کا خوف ک
ہوتا ہے، اچھے اخلاق کیا ہوتے ہیں تو ہم آپ کو فلاں بزرگ سے ملا دیں گے، اس
دنیا ہدایت نہیں پاتی اور دنیا میں کوئی انقلاب رونما نہیں ہوتا۔ دنیا اُس وقت
اور غور کرنے پر مجبور ہوتی ہے، جب پورے معاشرہ کی سطح پر، پورے تمدن کی سطح پر، ع
اسٹیج پر (جس پر تمام دنیا کی نگاہیں پڑتی ہیں) صحیح اور مکمل اسلامی زندگی کا نمونہ پی
کیا جائے اور قوموں اور ملکوں کی نگاہیں یہ اندازہ لگا سکیں کہ اسلام کا عقیدہ انسا
کی زندگی میں یہ تبدیلی پیدا کر سکتا ہے، اللہ کے یہاں سے آئی ہوئی روشنی اور ہدا
کا نور اس کی زندگی کو اس طرح چمکاتا اور سنوارتا ہے، شریعت کی تعلیمات کس طرح
معاشرہ پیدا کرتی ہیں، کس طرح کے اخلاق پیدا کرتی ہیں، جب تک یہ نہ ہو اس وقت
تک انسانیت کیا انسانیت کا کوئی چھوٹا سا کنبہ اور عالم انسانی کا ایک چھوٹا سا گوش
بھی توجہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

آج بھی دنیا کی ضرورت یہ ہے کہ کسی ملک کا پورا معاشرہ اسلامی زندگی کی
نمائندگی کر رہا ہو۔ اسلامی اخلاق کیسے ہوتے ہیں، مسلمان کس طرح اس پر یقین رکھتا
ہے کہ "الصدق ینجی، والکذب یھلک"[1] اس کے دل کی گہرائی میں یہ بات بیٹھ گئی
ہے کہ صحیح کردار نجات دیتا ہے، کامیاب کرتا ہے اور غلط بیانی اور غلط طرز کی زندگی
انسان کو ہلاک کرتی ہے، اس کو یقین ہو کہ "العاقبۃ للمتقین" انجام متقین ہی کا ہوتا ہے
اس کو یقین ہو کہ "قد افلح من زکاھا وقد خاب من دساھا" (کامیاب ہوا جس نے

[1] سچ نجات دلاتا ہے اور جھوٹ ہلاک کر دیتا ہے۔

ں کا تزکیہ کیا اور ناکام ہوا جس نے اس کو خاک میں ملا دیا) اس کو یقین ہو" وان الدار
خرۃ لھی الحیوان" (آخرت کی زندگی ہی حیات اصلی ہے) اس کو یقین ہو کہ
رت اللہ کی طرف سے آتی ہے، اچھے اعمال میں تاثیر ہے، غلط اعمال کرنے سے ناکامی
تی ہے اور صحیح زندگی اختیار کرنے سے کامیابی ہوتی ہے۔ یہ حکومتوں کی سطح پر ملکوں
سطح پر، معاشروں کی سطح پر، سوسائٹی کی سطح پر ہو، اور منظر عام پر یہ حقیقت جلوہ گر
۔ آج ہم کسی ایک ملک کا نام نہیں لے سکتے کہ تم آنکھ بند کر کے اس میں چلے جاؤ
ھ لو کہ اسلام کیا ہوتا ہے، اسلامی اخلاق کیا ہوتے ہیں، مسلمان جھوٹ نہیں
تا، مسلمان ناپ تول میں کمی نہیں کرتا، مسلمان دھوکہ نہیں دیتا، مسلمان زر کا پرستار
یں ہے، مسلمان عاجل اور وقتی منافع کے لئے آجل اور دائمی منافع کو قربان نہیں
تا، مسلمان اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتا، مسلمان ظلم کرنا نہیں جانتا، مسلمان نے
ھوکہ دینے کا سبق نہیں پڑھا، مسلمان کو بڑی سے بڑی سیم وزر کی تھیلی اور بڑی سے
ی پیشکش خرید نہیں سکتی، مسلمان اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرتا، مسلمان جس بات کو
ق سمجھتا ہے اس پر اپنا گھر لٹا سکتا ہے۔ سر کٹا سکتا ہے، اس پر اپنے خاندان کو
طرہ میں ڈال سکتا ہے، اپنے پیٹ پر پتھر باندھ سکتا ہے، فاقہ کر کر کے مر سکتا ہے،
لین کفر وضلالت اور ظلم وستم کا راستہ نہیں اختیار کر سکتا۔ آج پوری دنیائے اسلام
ی سب سے بڑی احتیاج، اس کا سب سے بڑا فاقہ، اس کا سب سے بڑا فقر، اس
ی سب سے بڑی طلب، اس کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ کوئی ایسا معاشرہ
یار ہو جائے، جس کی طرف انگلی اٹھا کر ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکیں کہ اسلام کو
یکھنا ہو تو اس معاشرہ کو دیکھ لو۔

میرے پاکستانی دوستو اور بھائیو! آپ کا ملک اس امید پر بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا
ہ اس دعوی پر اور اس دلیل پر قائم ہوا تھا کہ آپ دنیا کو اسلامی معاشرہ قائم کر کے

کوئی فرق نہیں، ہماری ان کی زبان میں کوئی فرق نہیں، ہماری ان کی نسل میں کوئی فرق نہیں، یہ بھی اسی خاک سے پیدا ہوئے، ہم بھی اسی خاک سے پیدا ہوئے، ہم بھی عدنانی اور قحطانی ہیں اور ہم بھی قریشی، ہاشمی اور اموی ہیں، مخزومی اور تیمی ہیں، ہماری زبان بھی ایک ہے، قرآن مجید جس زبان میں نازل ہوا ہے اس کو ہم ان کے برابر سمجھتے ہیں، پھر کیا بات ہے کہ ہم جانوروں کی زندگی گزار رہے ہیں، یہ فرشتوں کی زندگی گزار رہے ہیں، یہ اپنے مہمانوں کو کھلانے کے لئے اپنے بچوں کو بھوکا رکھتے ہیں، یہ مہمانوں کو اطمینان دلانے کے لئے پھونک مار کر چراغ بجھا دیتے ہیں[1]، یہ اپنے بچوں کے سامنے کی روٹی اٹھا کر اپنے ان بھائیوں ان پردیسی مسافروں کے سامنے رکھ دیتے ہیں، جن سے ان کا دین کا اختلاف ہے، عقیدہ کا اختلاف ہے اور جو ابھی تک ان کے مخالف اور برسر جنگ رہے۔ کیا بات ہے؟ یہ انقلاب ان میں کہاں سے آیا؟ ہمارے اور ان کے درمیان یہ زمین اور آسمان کا فرق کیسے پیدا ہو گیا؟

انسان انسان ہے، سوچنا اس کی فطرت ہے اندر سے جو سوال ابھرتے ہیں ان کے جواب دینا اس کی فطرت ہے، انسان کا ضمیر کتنا ہی سو جائے، لیکن وہ مرتا نہیں ہے، وہ جاگ اٹھتا ہے۔ ان کے دل نے ان سے سوال کیا اور جب دل سوال کرے تو اس کا ٹالنا آسان نہیں ہوتا۔ ہم آپ سوال کریں، راستہ چلتا کوئی سوال کرے، تو اس کو دس بہانوں سے خاموش کیا جا سکتا ہے، لیکن جب دل پوچھنے لگے، جب دیکھنے والی آنکھیں پوچھنے لگیں، جب سننے والے کان پوچھنے لگیں، جب جسم کا ریشہ ریشہ سوال کرنے لگے کہ اے اللہ کے بندو! اللہ کے لئے بتاؤ کہ یہ کل مکہ سے آئے تھے، ابھی تھوڑے دن ہوئے اور تمہارے ہی بھائی بند ہیں، یہ جھوٹ نہیں بولتے، یہ دھوکہ نہیں دیتے، دوسروں کو کھلائے بغیر ان کے حلق سے نوالہ نہیں اترتا، یہ مہمانوں کا

---

[1] دیکھئے حضرت ابوطلحہ انصاری کا قصہ اور آیت "ویؤثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ" کی تفسیر۔

خیال اپنے بچوں سے زیادہ کرتے ہیں، ان کو دنیا کی کوئی طاقت خرید نہیں سکتی، یہ صرف ایک اللہ سے ڈرنے والے ہیں، تو ان کے دل میں ایک کھٹک پیدا ہوئی، جس نے مکہ تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑا، وہ مکہ میں اپنے گھروں تک پہنچ گئے آرام سے لیٹ گئے لیکن وہ چبھن تھی کہ ہو رہی تھی کہ آخر کیا بات ہے، یہ انقلاب عظیم کہاں سے برپا ہوا؟

پھر انہوں نے خود جواب دیا کہ کوئی چیز تلاش کرنے سے بھی نہیں معلوم ہوتی، ایک ہی غذا ہم کھاتے تھے، ایک ہی طرح کا کپڑا ہم سب پہنتے تھے، آپ کو معلوم ہے کہ عرب کا لباس ایک تھا، یہ پاکستان کے سے دس اور ہندوستان کے سے پچاس لباس نہیں تھے، سارا عرب ایک طرح کا لباس پہنتا تھا، شکلیں بھی ان سب کی ایک تھیں عرب من حیث القوم داڑھی رکھتے تھے، عربوں کے نام بھی عام طور پر ایسے ہوتے تھے کہ آج بھی اگر کوئی دیکھ لے تو مسلمان سمجھا جائے گا۔ وہ چیزیں جو اسلام نے حرام کی ہیں پہلے سے ان کی فطرت سلیم ان سے ابا کرتی تھی، وہ خنزیر نہیں کھاتے تھے وہ غیر مذبوح چیزیں بھی نہیں کھاتے تھے، یہ ساری چیزیں ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہیں، پہناوا ایک، غذا ایک، زبان ایک لہجہ ایک، آب ہوا ایک، وطن ایک قوم ایک، پھر کیا بات ہے کہ یہ فرشتے ہیں اور ہم جانور، وہاں ان کو جواب ملتا تھا کہ یہ اسلام کا کرشمہ ہے، اس سے وہ مسلمان ہوتے چلے جا رہے تھے اور یہ حالت ہوگئی تھی کہ جیسے تسبیح ٹوٹ جائے تو دانے ایک کے اوپر ایک گرنا شروع ہوتے ہیں، دانوں کی بارش ہو جاتی ہے اسی طرح اسلام لانے والوں کی بارش ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے وحی کے الفاظ میں اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے "یدخلون فی دین اللہ افواجا" (اسلام میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں)۔

میرے بھائیو اور بزرگو! آج کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ پاکستان میں ایک اسلامی معاشرہ قائم کریں، جس کے دیکھنے کے بعد سیاح یا نو وارد کہے کہ ہم نے ایسا اچھا،

صالح اور طاقتور معاشرہ، اقتدار اور تہذیب کی بنیاد اور اس کا سرچشمہ ہے

یہ تقریر ۲۵ مئی ۱۹۸۴ء کو مؤتمر عالم اسلامی (کراچی) کی طرف سے دیئے گئے استقبالیہ اور عشائیہ کے موقع پر بہادر یار جنگ اکاڈمی بہادر آباد کراچی میں کی گئی، جس میں نہ صرف کراچی بلکہ پاکستان کی سطح پر بھی چیدہ برگزیدہ شخصیتیں اور فضلاء و دانشور خاصی تعداد میں موجود تھے۔ اس جلسہ کے داعی و منتظم ڈاکٹر انعام اللہ خان رکن تاسیسی رابطہ عالم اسلامی و سکریٹری مؤتمر عالم اسلامی نے خیر مقدمی و تعارفی تقریر کی اسکے بعد حسب ذیل خطاب ہوا۔

حضرات! ایسی باوقار نشستوں اور ایسی مجلسوں کی اگر کوئی قدر و قیمت اور اہمیت ہے تو یہ ہے کہ کچھ حقائق سامنے آئیں اور کسی صاحب دل، صاحب ضمیر اور حساس آدمی کے دل کو کوئی بات لگ جائے اور وہ اس کا داعی اور علمبردار یا کم سے کم اس کا مؤید بن جائے۔

عالم اسلام کے متعلق کچھ عرض کرنا دشوار بھی ہے، ناخوشگوار بھی اور نازک بھی۔ میں اپنے محدود تاریخی مطالعہ کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ حملۂ تاتار کے بعد سے شاید عالم اسلام پر ایسا سخت وقت اس سے پہلے نہیں آیا، اس وقت عالم اسلام میں جتنی حکومتیں قائم ہیں، جتنے آزاد مسلم ممالک پائے جاتے ہیں، عالم اسلام کے جو ذخائر ہیں، جو وسائل اور امکانات پائے جاتے ہیں وہ اس سے پہلے کبھی

عالم اسلام کے پاس نہیں تھے۔ بعض چیزیں جو صنعتی نظام میں، اور دنیا کے تمدن اور ترقی کے نظام میں، شہ رگ کا کام دیتی ہیں، وہ چیزیں اس وقت عالم اسلام کے پاس وافر طریقہ پر موجود ہیں، بہت سے شعبے ایسے ہیں جن میں معاصر ترقی یافتہ دنیا کو عالم اسلام کی احتیاج ہے اور ان میں اسلام سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا لیکن (ان سیاسی، اقتصادی، مادی پہلوؤں سے قطع نظر کرکے) اس وقت عالمِ اسلام کی سب سے بڑی آزمائش اور عالم اسلام کے لئے سب سے بڑی تشویش کی بات اس کی معنوی طاقت کی کمی ہے۔ آپ سب حضرات اہل نظر و اہل علم ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ تاتاریوں نے عالم اسلام کی چولیں ہلا دیں تھیں۔ انہوں نے عالم اسلام کو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا نہیں کیا تھا موت کے منہ میں دے دیا تھا۔ عالمِ اسلام پر کبھی یاس کی ایسی کیفیت (میرے علم و مطالعہ میں) طاری نہیں ہوئی تھی، جتنی کہ تاتاریوں کے زمانہ میں طاری ہوئی تھی۔ اس کی ایک معمولی سی مثال یہ ہے کہ اس وقت کی ایک کہاوت تھی کہ ہر بات مان لینا، ہر بات باور کر لینا سوائے اس بات کے کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی۔ وہ الفاظ اس طرح نقل کئے گئے ہیں جو عالم عربی میں زبان زد تھے "اذا قیل لك ان التتر انھزموا فلا تصدق" اگر تم سے کوئی معتبر سے معتبر آدمی بھی یہ کہے کہ تاتاریوں نے کسی معرکہ میں کسی موقع پر شکست کھائی تو اس کو باور نہ کرنا، یہ بات قابل یقین نہیں ہے۔ اُس وقت عالم اسلام سیاسی و فوجی و انتظامی لحاظ سے تاتاریوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے پامال ہو چکا تھا اور گویا سکرات کی حالت میں تھا۔

لیکن امید کی ایک روشنی تھی، وہ یہ کہ عالم اسلام اگرچہ اخلاقی زوال کا شکار ہو گیا تھا (اور ایسے غیر معمولی حوادث بغیر اخلاقی زوال کے پیش نہیں آیا کرتے)[1] لیکن اس

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ اول ص ۳۰۳-۳۱۴ سے زیر عنوان (بقیہ اگلے صفحہ پر)

سے نکل آتی اور کتے کے لئے وہ ان کو قربان کر دیتا اور اگر وہ کہتے کہ کُتا مجھ سے زیادہ عزت والا ہے تو ان کا ایمان خطرہ میں پڑ جاتا تھی۔ آرنلڈ نے Preaching of Islam میں بھی اس کو ایک دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے، اس نے لکھا ہے کہ انہوں نے یہ جواب دیا کہ اگر ہمیں ایمان کی دولت نصیب نہ ہوئی ہوتی تو یہ کُتا ہم سے ہزار درجہ افضل تھا اور یہ کچھ بعید از قیاس اور اسلامی عقیدہ کے خلاف نہیں ہے، لیکن قدیم فارسی تاریخوں اور ترکی مآخذ میں یہ واقعہ اُسی طرح بیان کیا گیا ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا۔

تو اس وقت عالم اسلام کے پاس ایک بڑی طاقت تھی وہ روحانی معنوی طاقت تھی اور اس نے اپنا کام کیا اور جیسا کہ خود آرنلڈ نے لکھا ہے کہ اس وقت سب سے زیادہ ناقابل قیاس اور ناقابل یقین یہ پیش گوئی تھی کہ تاتاری اپنے لئے اسلام کا انتخاب کریں گے۔ ان کے سامنے کسی مذہب کے انتخاب کا مسئلہ آتا تو سب سے پہلی امیدوار مسیحیت تھی، اس لئے کہ اُن کی حرم سراؤں میں عیسائی عورتیں تھیں، لیکن اس نے لکھا ہے کہ اسلام اپنے خاکستر کے نیچے سے برآمد ہوا اور اس نے تاتاریوں پر فتح پالی۔ میں اس وقت جو بات آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ حکومت و اقتدار ثانوی چیز ہے وہ دراصل ایک خاص طرح کی زندگی اور صورتِ حال کا ارتقاء ہے، اصل چیز نہیں ہے، اصل چیز جو حکومتوں کو بنانے والی ہے وہ معاشرہ ہے۔ اگر معاشرہ صحت مند ہے، معاشرہ اخلاقی زوال کا شکار نہیں ہوا ہے اور معاشرہ (اچھے اور صالح) افراد پیدا کر رہا ہے اور پیدا کر سکتا ہے تو پھر تشویش کی کوئی بات نہیں۔ حکومتیں بدلتی رہیں گی لیکن معاشرہ وقت کے مطابق نئی نئی حکومتیں عطا کرتا رہے گا۔

میں مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ ــــ کے

بعد شہاب الدین محمد غوری نے اور قطب الدین ایبک نے یہاں اسلامی سلطنت کو مستحکم کیا اور تقریباً پورا ہندوستان مسلمانوں کے زیر نگیں آگیا، یہ خاندان غلاماں تھا، غزنوی کے بعد خاندان غلاماں نے حکومت کی اس کے بعد خلجیوں نے حکومت کی، اس کے بعد تغلق آئے، لودھی آئے، سوری آئے، سب کے بعد مغل آئے، یہ سب مختلف خاندان تھے، اور مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے تھے، ان کے درمیان کچھ تہذیبی اختلافات بھی تھے اور کچھ زبانوں کا فرق بھی تھا، لیکن درحقیقت برصغیر کا مسلم معاشرہ اس پورے عرصہ میں ایک صاحب صلاحیت اور صحت مند معاشرہ کی حیثیت سے قائم رہا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خاندان بدلتے رہے لیکن اسلامی حکومت میں کوئی فرق نہیں آیا، اگر مسلم معاشرہ اس قابل نہ ہوتا تو فوراً وہ برہمنی عنصر اور وہ غیر مسلم طاقت جو تاک میں تھی غالب آجاتی کیونکہ اُس کو وہ سب قوتیں حاصل تھیں جو بڑی وسیع حکومتوں کی بنیاد رکھتی ہیں، اس کا مذہب اس ملک کا اصل مذہب تھا، اس کی تہذیب اس ملک کی اصل تہذیب تھی۔ مسلمان نو وارد تھے لیکن جس چیز نے "انتقال سلطنت" کو کلی طور پر "انقلابِ سلطنت" میں تبدیل نہیں ہونے دیا وہ کسی خاندان کی قابلیت نہیں تھی، وہ مسلم معاشرہ کی قابلیت تھی کہ خاندان بدلتے رہے لیکن ایک ہی مسلم حکومت رہی، ایک ہی آئین (اسلامی آئین) رہا، ایک ہی عائلی قانون شرع (محمدی) رہا، ایک ہی تہذیب رہی یعنی عربی ہندوستانی، ترکستانی، ایرانی تہذیب کا آمیزہ، جس پر اسلامی چھاپ غالب تھی، دربار کی زبان ترکی رہی یا فارسی اور دربار اور دفتر کی زبان فارسی رہی اور دین وعلم کی زبان عربی۔ ان میں سے کسی چیز میں کوئی تغیر نہ ہوا۔

آپ حضرات کو غور کرنا چاہیئے کہ کسی ایک خاندان کے زوال کے بعد کتنا بڑا موقع تھا کہ فوراً ہندو عنصر غالب آجائے اور اس کی جگہ لے لے، یعنی جب خاندان غلاماں

کا زوال ہوا اور سلطانہ رضیہ تخت سلطنت پر بیٹھی (اور اسلامی حکومتوں کی تاریخ میں یہ بڑا نازک مرحلہ تھا) میں سمجھتا ہوں کہ پوری اسلامی تاریخ میں ہندوستان جیسے وسیع خطہ میں ہندوستان کی جیسی پیچیدہ صورت حال میں کسی خاتون کا تخت سلطنت پر آنا بہترین موقع تھا کہ یہاں کی غالب اکثریت اس موقع سے فائدہ اٹھا لے اور صدیوں کے لئے اسلامی سلطنت کا چراغ گل ہو جائے، وہ کیا چیز تھی جس نے سلطانہ رضیہ کی حفاظت کی اور اس کے بعد پھر خلجی خاندان کے ہی ایک فرمانروا کو جو چیز تخت سلطنت پر لائی اور اس کے بعد خلجیوں سے حکومت بلبن خاندان کی طرف منتقل ہوئی۔ عبوری دور بڑا نازک ہوتا ہے۔ اس عبوری دور میں بہت سے عناصر کو موقع ملتا ہے کہ وہ اپنا کام کریں، لیکن ایک دن کے وقفہ کے بغیر بلکہ ایک گھنٹہ کے وقفہ کے بغیر ایک مسلمان فرمانروا خاندان کی جگہ پر دوسرا مسلمان فرمانروا خاندان آجاتا ہے۔ کیا یہ محض اتفاقی واقعہ تھا؟ کیا ہندوستان کے غیر اسلامی عنصر میں حوصلہ مندی کا جذبہ اور ہندوستان کے اپنے ملک ہونے کا احساس اتنا معدوم ہو گیا تھا کہ وہ اس صورت حال سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا؟ ایسا نہیں تھا۔ آپ تاریخ فیروز شاہی کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ایسا بارہا ہوا ہے کہ غیر مسلموں نے سازش یا کوشش کی ہے کہ وہ حاوی ہو جائیں لیکن ایسا نہیں ہونے دیا گیا۔ یہ کس بات کی دلیل تھی؟ اسی کا نتیجہ تھا کہ خاندانوں میں زوال آتا تھا، لیکن مسلم معاشرہ میں عمومی طور پر زوال نہیں تھا۔ اس میں وہی دینی جذبہ تھا، اس میں وہی دینی حمیت تھی، اس میں اسلام سے وہی محبت تھی، اس میں اسلام کے افہام و تفہیم کے وہ مراکز قائم تھے جن کو مدارس کہا جاتا ہے اس میں اسلام کی روحانیت کے تسلسل کے لئے وہ مرکز قائم تھے جن کو خانقاہوں کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں، محبوب الٰہی سلطان المشائخ حضرت خواجہ

نظام الدین اولیاءؒ کا تعلق سلسلۂ چشتیہ سے ہے۔ سلسلۂ چشتیہ والوں نے اصولاً
یہ طے کرلیا تھا کہ وہ اسلامی سلطنت کے لئے دعاگوئی کا فرض انجام دیں گے' اور
رہنمائی بھی کریں گے لیکن اس سے دور رہیں گے، کوئی عہدہ قبول نہیں کریں گے۔
اس اصول پر حضرت محبوب الٰہی شدت سے کاربند رہے۔ انہوں نے سلطنت کو
جاڑوں کی اس آگ کی طرح سمجھا کہ جس سے ذرا دور رہ کر تاپا جائے اور گرمی حاصل
کی جائے لیکن اس کے اندر داخل نہ ہوا جائے۔ وہ سلطنتوں سے اتنے دور رہتے
تھے کہ اُن کے حالات سے تو واقف رہے لیکن اس میں ملوث نہ ہوئے۔ ان کا دہلی کی
سلطنت سے ایسا تعلق تھا کہ جب کوئی سخت وقت آتا تھا تو دہلی کے فرمانروا ان کی
طرف رجوع کرتے تھے۔ ایک مرتبہ علاء الدین خلجی نے جب جنوب میں ملک عنبر کی ماتحتی
میں مہم بھیجی اور چوکیاں اٹھ گئیں اور بہت دنوں تک خبر نہیں آئی تو اندیشہ ہوا کہ اسلامی
فوج ضائع ہوگئی۔ بادشاہ نے پریشان ہوکر اپنے ایک معتمد کو حضرت خواجہ نظام الدین
اولیاءؒ کے پاس بھیجا اور کہا کہ حضرت کو مسلمانوں کی فکر اور مسلمانوں کی جان کی قیمت کا
احساس ہم سے زیادہ ہے۔ اس وقت ہمیں کوئی پتہ نہیں چل رہا ہے کہ ہماری فوج جو
جنوب کی طرف گئی تھی اس کا کیا حشر ہوا؟ ہم سب پریشان ہیں۔ حضرت نے جواب دیا کہ
"ان شاء اللہ خیریت ہے، بادشاہ کو فتح کی مبارکباد" اور کہنا کہ اور فتوحات بھی حاصل
ہوں گی۔" ایک طرف تو بادشاہ کو اطمینان دلایا، دوسری طرف اپنی خانقاہ کے سارے
ذاکرین کو ذکر چھڑا کر دعا کے لئے بٹھا دیا کہ تم دعا کرو۔ میں ایک دوسری مثال دیتا
ہوں۔ حضرتؒ جب رات کو آرام فرمانے کے لئے لیٹتے تھے تو خاص طور سے امیر خسروؒ
کو، جو بڑے مقرب تھے طلب فرماتے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ "کہو دہلی میں کیا ہو رہا
ہے؟" یہ گویا اخبار تھا اور رات کو حضرت یہ اخبار سنتے تھے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ
ہمارے مشائخ نے دنیا سے بالکل آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور وہ سلطنت وسیاست

کی بھی اپنی خانقاہوں میں نہیں لگنے دیتے تھے، غلط ہے۔ امیر خسروؒ حضرت کے بڑے معتمد، اس کے ساتھ سلطنت دہلی کے ایک بڑے رکن رکین تھے اور شاعر ہونے کی وجہ[1] سے وہ بہت سی ایسی چیزوں سے واقف ہو جاتے تھے جن سے انتظامی لوگ جن کا تعلق صرف انتظامی امور (Administration) سے ہو واقف نہیں ہو سکتے تھے۔

مسلم معاشرہ کا صحت مند رہنا اور اپنے اسلامی مزاج کو اپنی اسلامی سیرت وکردار کو قائم رکھنا اور کرپٹ (Corrupt) نہ ہونا یہ سلطنت کے استحکام کے لئے سب سے بڑی ضمانت ہے اور عالم اسلام کے استحکام اور قوت کا سرچشمہ اسلامی معاشرہ کی قوت ایمانی، حمیت اسلامی اور اس کی اخلاقی بلندی ہے۔ کسی ملک کے لئے سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ وہاں کا معاشرہ کرپٹ (Corrupt) ہو جائے، معاشرہ کا اس صلاحیت سے محروم ہو جانا جس سے کہ وہ صالح افراد مہیا کرتا رہے اور ضرورت کے لوگ دیتا رہے بڑے خطرہ کی بات ہے۔ اگر ضرورت کسی منتظم (Administrator) کی یا ایک سپہ سالار کی ہے تو وہ مہیا کرے، اگر ضرورت ہے ایک مفتی اور قاضی کی جو عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرے تو مفتی اور قاضی مہیا کرے، اگر اس ملک کو دانشوروں کی ضرورت ہے تو دانشور مہیا کرے۔ جب کسی معاشرہ سے یہ صلاحیت مفقود ہو جائے تو پھر سلطنت کا وہ معاملہ ہو جاتا ہے جس کو اقبال نے اپنے مشہور شعر میں بیان کیا ہے۔

حکومت کا تو کیا، رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا!

---

[1] مولانا علی میاں کس اختصار اور جامعیت کے ساتھ تفصیلات کو چند لفظوں میں سمیٹ لیتے ہیں۔ شعروادب کی ماہیت اور قوت پر اُن کی گہری نظر اور مطالعہ کا اندازہ نقوش اقبال کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ شاعر حقیقۃً زیادہ حساس ہوتا ہے اور مستقبل کو دیکھ سکتا ہے۔ ناشر۔

وہ چونکہ ایک دانشور شاعر اور فلسفی ہیں اس لئے وہ کہتے ہیں ؎

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا ر کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا[1]

لیکن میں اس سے آگے بڑھ کر کہتا ہوں، یہ بات اتنی تشویش کی نہیں ہے کہ ہم انڈیا آفس لائبریری میں ہندوستان کے مخطوطات دیکھیں اور برٹش میوزیم میں اپنے اسلام کے مخطوطات اور تبرکات کو دیکھیں، اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ہم مخطوطات کے بجائے اپنے جگر گوشوں کو ان کی گود میں دیکھیں اور ہمارا معاشرہ وقت پر صالح افراد مہیا نہ کر سکے۔ مجھے اس وقت ہندوستان کے مسلم معاشرہ کے بارے میں یہی فکر اور تشویش ہے اسی بنا پر ہم چند ناتواں اور بے مایہ آدمیوں نے "تحریک پیام انسانیت" وہاں شروع کی ہے کہ مسلم معاشرہ کو اس کرپشن (Corruption) سے بچایا جائے جو تیزی سے ہندوستانی سماج میں پیدا ہو رہا ہے۔

یہاں سب سے زیادہ جو خطرہ محسوس ہوتا ہے وہ معاشرہ کا کرپٹ ہو جانا ہے میں جب بھی یہاں آیا مجھے محسوس ہوا کہ مادیت کا غلبہ، دولت کی افراط جو برے نتائج پیدا کرتی ہے اور اخلاق میں جو تبدیلی لاتی ہے وہ یہاں نظر آرہی ہے، معیار زندگی تیزی کے ساتھ بلند ہو رہا ہے، کسی آدمی کا دولت مند ہونا اس کے احترام کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے، یہاں تک کہ عزیزوں کے تعلقات، باپ بیٹے کے تعلقات اور بھائیوں کے تعلقات پر بھی اس کا اثر پڑ رہا ہے۔ اس بارے میں رباط و مراکش سے لے کر بحرین و کویت تک کے ممالک میں کوئی فرق نہیں کہ معیار زندگی اتنا بلند ہو گیا ہے کہ لوگ اپنی عادتوں کے غلام بن گئے ہیں اور وہ مہم جوئی و خطر پسندی کا قدم نہیں اٹھا سکتے۔

آپ عربوں کو دیکھیں، اسلامی فتوحات کا اصل راز تو صحابۂ کرام کی قوت ایمانی تھی

---

[1] بانگ درا۔ نظم "خطاب بہ جوانانِ اسلام"۔

جس کو ساری دنیا تسلیم کرتی ہے، لیکن ظاہری اسباب کے طور پر ایک اور چیز بھی تھی، وہ ان کی زندگی کی سادگی تھی۔ وہ اپنی عادات کے غلام نہیں تھے، وہ دن بھر کھانا چھوڑ سکتے تھے، وہ چائے کے، پان کے کسی چیز کے غلام نہیں تھے، وہ پورا پورا دن گھوڑے کی پیٹھ پر گزار سکتے تھے، وہ سوکھی روٹی کھا سکتے تھے، کھجور پر گزارا کر سکتے تھے جب کہ رومی و ایرانی ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے سنا ہے کہ بخارا میں جب پہلی مرتبہ روسی یورش ہوئی اور اچانک معلوم ہوا کہ روسی لشکر آگیا ہے تو وہاں کے شرفاء و معززین نے کہا کہ کیسے اکھڑ اور گنوار لوگ ہیں کہ بغیر چائے پیئے میدان میں آگئے؟ ہم تو یہ نہیں کر سکتے، ہم پہلے چائے پیئں گے پھر شریفوں اور معقول لوگوں کی طرح میدان میں آئیں گے۔ تو جب کسی معاشرہ میں عادات کی غلامی اس درجہ تک پہنچ جائے تو پھر کوئی کام نہیں کر سکتا۔ مجھے جو خطرہ یہاں محسوس ہوتا ہے وہ معیار زندگی کی روز افزوں بلندی، سامان آسائش کی بہتات، دولت کی ریل پیل اور اس کا عمارتوں میں استعمال ہے میں اس سے پیشتر یہاں ۱۹۷۸ء میں آیا تھا؟ اس کے بعد میں اب آیا ہوں۔ اس مختصر سے وقفہ میں بھی مجھے بڑا فرق نظر آیا۔

اس وقت ملک کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ اس ملک میں اصلاح معاشرہ کی کوشش کی جائے اور مہم چلائی جائے۔ اس وقت ملک کی بنیادی ضرورت اصلاح معاشرہ ہے۔ دولت میں جو مسابقت کا جذبہ اور دوڑ پیدا ہوگئی ہے، اس سے اس معاشرہ کو بچانے کی ضرورت ہے، یہ اس وقت کا اہم ترین کام ہے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے "فذکر فان الذکری تنفع المؤمنین" کہ کسی نو وارد کے اور کسی دور افتادہ بھائی کے کہنے سے اور زور دینے سے ایک خیال ابھر آتا ہے۔ اس بنا پر میں عرض کرتا ہوں کہ خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد اس سے بڑا حادثہ نہیں ہوگا کہ پاکستان انتشار کا شکار ہو۔ میں ہر چیز کو اس کے مقابلہ میں ثانوی سمجھتا ہوں۔ پاکستان مستحکم رہے،

پاکستان اپنا اسلامی اخلاقی کردار ادا کر سکے، یہ ملک کی سب سے بڑی اور پہلی ضرورت ہے، اس کے بعد کے سارے قصے ثانوی اور ثالثی درجہ کے ہیں۔ وہ بالکل حاشیہ کی باتیں ہیں۔ موت وحیات کا فیصلہ کرنے والی جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان باقی رہے، پاکستان مستحکم رہے، پاکستان انتشار سے محفوظ رہے، پاکستان اپنا امتیاز ثابت کر سکے۔ اس کے لئے اصلاح معاشرہ کی ضرورت ہے، یہ اخلاقی زوال جو تیزی کے ساتھ آرہا ہے اسے روکا جائے، افراط زر کے بدترین نتائج و اثرات جو ہمارے معاشرہ پر مرتب ہو رہے ہیں، ان میں کسی درجہ میں بریک لگایا جائے، مسجدوں کے منبروں سے یہ صدا بلند کی جائے، سیاسی انجمنوں کے اسٹیجوں سے اور اس جیسی مؤتمر اسلامی، اور اس طرح کی تنظیموں کے پلیٹ فارم سے بھی یہ بات کہی جائے۔ پاکستان کو بچانے کے لئے اس وقت دو چیزوں کی سخت ضرورت ہے، ایک تو اس کو عقائدی اور مذہبی انتشار سے بچایا جائے جو اس کے لئے سخت خطرناک ہے۔ مختلف گروہ بنے ہوئے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ پاکستان پر ان کی جماعت کا اقتدار ہو۔ اصل میں مطمح نظر صرف یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ پر جو بھی فائز ہو وہ ہم سے پوچھ کر کام کرے اور دنیا کو یہ معلوم ہو کہ اس مسلک وخیال کے لوگ یہاں زیادہ قابل اعتماد اور قابل احترام سمجھے جاتے ہیں۔

دوسرے سیاسی انتشار سے ملک کو ہر قیمت پر بچایا جائے، ہر کمزوری کو برداشت کیا جائے، ستر کمزوریوں کو برداشت کیا جائے لیکن پاکستان کے استحکام کو، اس کی وحدت کو اور اس کی سالمیت کو ہرگز خطرہ میں نہ ڈالا جائے۔ سب گوارا کیجئے اور اپنے ذمہ داروں کی غلطیوں کو برداشت کیجئے۔ دیکھئے میں اس گروہ سے تعلق رکھتا ہوں جو خلافت اموی کو معیاری نہیں سمجھتا اور میرا تاریخی مطالعہ بھی یہی بتاتا ہے، لیکن میں اس کو مسلمانوں کی بصیرت سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں نے خلفائے بنی امیہ، پھر خلفائے بنی عباس کو (جو خلفائے راشدین کے معیار کے ہرگز نہیں تھے) حکومت کرنے کا موقع

دیا اور روز روزان کے خلاف خروج نہیں کیا، نہ ہر مرتبہ ھل من جدید؟ ھل من جدید؟ کا نعرہ لگایا، اس کے نتیجہ میں اتنی بڑی سلطنت بنی اور اسلام کی اشاعت ہوئی اور اس برصغیر تک اسلام کی شعاعیں پہنچیں۔ اس میں صرف ایک ہی ہستی کا استثنار ہے اور وہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کے متعلق برملا کہوں گا کہ ان کا اقدام صحیح تھا اور جب اس طرح کے حالات ہوں، جن کے برداشت کرنے کی (از روئے شرع دینی بصیرت) بالکل گنجائش نہ ہو، تو اہل عزیمت وبصیرت کے سامنے ان کی مثال اور ان کا نمونہ ہے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

حضرات! تاریخ بتاتی ہے کہ بہترین جمہوریتوں کے زمانہ میں بھی جب معاشرہ کرپٹ (CORRUPT) ہوگیا، فاسد ہوگیا تو اس نے ان جمہوریتوں کے چراغ گل کر دیئے اور ان کے لئے جتنے امکانات کامیابی کے ہو سکتے تھے سب ختم کر دیئے۔ معاشرہ صحت مند ہے، معاشرہ اخلاقی معیار رکھتا ہے تو بہتر سے بہتر ریاست قائم ہو سکتی ہے، بہتر سے بہتر انتظامیہ بن سکتی ہے، لیکن معاشرہ اگر اپنی خصوصیتوں کو کھو چکا ہے، تو کوئی بڑی سے بڑی جمہوریت بھی کامیاب نہیں ہو سکتی اور کوئی سامری بھی اس گوسالہ میں روح نہیں پھونک سکتا۔

میں اپنے محترم دوست ڈاکٹر انعام اللہ خاں کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری عزت افزائی کی اور ایسے مؤقر مجمع کے سامنے اپنے خیالات وتجربات پیش کرنے کا موقع دیا۔ میں آپ سے اپنی صاف گوئی ودراز نفسی اور جسارت کی معافی چاہتا ہوں اور آپ سب کا اس اعزاز وتوقیر کے لئے شکر گزار ہوں۔

صحیح اسلامی اقتدار کی ذمّہ داری اور اسکے برکات

(یہ تقریر ۲۷ رمئی ۱۹۸۴ء کو اس عظیم جلسہ میں کی گئی جس کا انتظام فاران کلب کی جانب سے کراچی کے مشہور میٹروپول ہوٹل میں کیا گیا تھا اور جس میں اعلیٰ عہدہ دار شہر کے معززین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کثیر تعداد میں موجود تھے۔)

حمد وصلاۃ کے بعد!

اعوذ باللہ من الشّیطانِ الرّجیم۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور[۱]

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

حضرات! میں اپنے معزز داعیوں اور اس سوسائٹی کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے ایک ایسے منتخب مجمع سے خطاب کرنے کا موقع دیا اور عزت افزائی کی۔

حضرات! چھٹی ساتویں صدی مسیحی کی تاریخ آپ کے سامنے ہے جس میں ظہورِ اسلام اور بعثت محمدی کا تاریخ ساز، عہد آفریں، انقلاب انگیز، زلزلہ خیز واقعہ پیش

---

[۱] سورۃ الحج : ۴۱

آیا اور میں سمجھتا ہوں کہ کسی زبان میں اس کی عظمت کی گہرائی و گیرائی ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ آپ میں سے جو لوگ اُس وقت کی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں اور جنہوں نے بعثت کی معاصر دنیا اور اس کے قبل کے عہد (جس کو جاہلیت کے بلیغ و عمیق لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے) کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ غالباً کوئی ملک بھی ایسا نہیں تھا جہاں خدا شناس، خدا ترس، انسانیت دوست اور ایک حد تک پاکباز انسان نہ پائے جاتے ہوں، لیکن ان کا حیاتِ انسانی اور ذہن انسانی پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا، اس لئے کہ افراد کا اثر زیادہ تر افراد پر پڑتا ہے، تمدنوں اور مختلف طبقاتِ انسانی پر یہ افراد اثر انداز نہیں ہو سکتے، اگر اس زمانہ کی مفصل روداد (ریکارڈ) ہمارے سامنے ہوتی تو ہمیں معلوم ہوتا کہ جن صالحین، جن دانشوروں یا جن فلاسفہ و معلّمین اخلاق کے حالات ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں، بعض اوقات ان کے خاندان پر بھی ان کا اثر نہیں تھا۔ ان کے خاندان والے قریبی رشتہ دار بھی تاویل کر لیا کرتے تھے کہ اگر یہ نیک نہ بنیں گے تو کیا بنیں گے؟ ان کے وسائل قلیل، ان کی خواہشات محدود، ان کی عمر ایک خاص مرحلہ پر پہنچ چکی ہے، دنیا ان سے بے نیاز ہے۔ وہ ان سے پوچھ کر نہیں چلتی، اس لئے یہ اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہوئے ہیں، اپنے خیالات میں مگن ہیں انسانی ذہن میں غور کرنے اور تہ تک پہنچنے کی اللہ نے جو فطری صلاحیت رکھی ہے وہ اس وقت تک بیدار نہیں ہوتی جب تک کہ اس کے سامنے کوئی حقیقت بڑی وسیع، عمیق اور طاقتور شکل میں نہ آئے اور اس کو سوچنے پر مجبور نہ کر دے۔ یہ نوعِ انسانی کی بدقسمتی تھی کہ افراد کا دائرہ اثر سمٹتے سمٹتے اس صفحۂ حیات پر ایک نقطہ بن کر رہ گیا تھا۔ ایک چھوٹا سا نقطہ جو بعض اوقات خوردبین کے بغیر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ زندگی کا چکر جس طرح چل رہا تھا، چلتا رہا، زندگی کا پہیہ جس طرح گھوم رہا تھا گھومتا رہا۔ جو لوگ حاوی تھے ان کا اقتدار اسی طرح قائم تھا۔ کوئی چیز

ایسی نہیں تھی جو ان کو جھنجھوڑ کر رکھ دے اور اندر سے ان کے ضمیر کو پکڑ لے اور ہلائے اور کہے کہ اس کا جواب دینا ہوگا۔ اس کی توجیہ کرنی ہوگی کہ یہ کیا ہوا، یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ بات جب ہوتی ہے جب کسی امت کی سطح پر، کسی عالمگیر دعوت کی سطح پر، اور ایک ایسے ماحول کی سطح پر جس میں طبقات انسانی کی پوری نمائندگی ہو، اس میں ہر طبقہ کے لوگ ہوں، ہر پیشہ کے لوگ ہوں، ہر سطح کے لوگ ہوں ایک نیا معاشرہ وجود میں آتا ہے اور وہ ایک نئی زندگی کا تجربہ پیش کرتا ہے، تب دنیا غور کرنے پر مجبور ہوتی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس مقصد کے لئے ایک امت سامنے لائی گئی قرآن کے لفظ بتاتے ہیں کہ اس امت کی حیثیت کسی دعوت کے آہستگی سے قبول کر لینے اور اس پر بیٹھ کر عمل کر لینے والوں کی نہیں تھی۔ یہ امت اللہ کے فیصلہ کے مطابق دنیا کے منظر عام (عالمی اسٹیج) پر لائی گئی جو معاذ اللہ ایکٹر (Actor) کی (اداکار و ممثل) کی حیثیت سے نہیں، فیکٹر (factor) یعنی ایک طاقتور تاریخی عامل کی حیثیت سے کام کرنے والی تھی۔

یہ وہ واقعہ تھا جس نے دنیا کی تاریخ نہیں دنیا کی تقدیر بدل دی، ایک نئی امت مبعوث کی گئی جس نے ساری دنیا کو متوجہ کیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک کے متعلق تاویل کیجا سکتی ہے، دو کے متعلق، چار کے متعلق، پچاس کے متعلق، یہ لاکھوں انسان چند اصولوں اور چند عقائد کے قائل ہوئے تو اپنی سابقہ زندگی کو بالکل بھول کر اور اس کو ترک کر کے انہوں نے زندگی کا ایک نمونہ جس سے دنیا ناآشنا ہو چکی تھی دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اب حکمرانی اللہ کی ہے، اب حکمرانی شریعت اسلامی، شریعت محمدی کی ہے۔ اب حکمرانی انسانیت کی خیر خواہی کی ہے۔ اب حکمرانی آخرت کے یقین کی ہے، اب حکمرانی ایثار و قربانی کی ہے، اب حکمرانی زہد و اخلاص کی ہے، اب حکمرانی خواہشات کی نہیں ہے، اب حکمرانی ایک بالاتر طاقت کی غلامی کی (اساس پر قائم) ہے۔ وہ "تکبیر مسلسل" جو وسعت افلاک میں گونجی تھی، اب دکانوں

میں بھی اس کا نغمہ سنا جانے لگا اور مکانوں میں بھی ۔ وہ عبادت گاہوں تک محدود نہیں ہے بازاروں کی مشغول کر دینے والی فضاؤں بلکہ میدان جنگ تک کے رستخیز میں بھی سنی جاتی ہے ۔ وہاں بھی یہ امت جو نماز کی پابند ہے ۔ صلوٰۃ الخوف پڑھتی ہے ۔ وہاں بھی اپنے اللہ کو نہیں بھولتی ۔ ان کے خلفاء و حکمراں وہ ہیں کہ روم و ایران کے صدیوں سے جمع ہونے والے خزانے ان کے قدموں کے نیچے ہیں ، لیکن کیا مجال وہ اپنی ذات پر کچھ خرچ کرلیں ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان کی اہلیہ محترمہ کہتی ہیں کہ بچوں کا بہت دنوں سے منہ میٹھا نہیں ہوا ۔ منہ کا مزا خراب ہے ۔ آپ جب خلیفہ نہیں تھے اور آزاد پیشہ (تجارت) کرتے تھے تو ہم مختلف قسم کی چیزیں پکاتے اور کھاتے تھے ۔ اب جب سے آپ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی ہے اور روزینہ مقرر کر دیا ہے ہمارا پورا گھر تنوع اور مختلف مزوں سے محروم ہے ۔ "حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ "مسلمانوں کا بیت المال اس لئے نہیں کہ ابوبکر کے گھرانے کا منہ میٹھا کرے " اہلیہ صاحبہ نے کہا کہ "اچھا اگر خود ہم اپنی خوش انتظامی اور کفایت شعاری سے اس روزینہ میں سے کچھ بچا کر آپ کو دے دیں تو آپ اس سے وہ سامان لا سکتے ہیں جس سے میٹھا تیار ہو سکے " انہوں نے کہا " اس میں کیا حرج ہے؟ یہ تو تمہاری سلیقہ مندی کی بات ہے " زوجۂ محترمہ نے ایک ایک دو دو درہم جمع کرنے شروع کئے ۔ اس سے کم میں انہوں نے گھر کا انتظام کر لیا ، اس کے بعد انہوں نے کہا ۔ "دیکھئے یہ آپ کے بیت المال سے نہیں آیا ہے ، جو کچھ ہم کو ملتا ہے اسی سے ہم نے بچایا ہے " انہوں نے اُن کی تعریف کی اور پیسے لے لئے اور بیت المال کے ذمہ دار کو بلایا اور کہا کہ "تجربہ نے ثابت کر دیا کہ ابوبکر کے گھرانے کا گزارا اس سے کم پیسے میں بھی ہو سکتا ہے ۔ اس لئے یہ تو بیت المال میں جمع کر لو اور آئندہ اتنا کم کر کے بھیجا کرو "

حضرت عمر بن عبدالعزیز ؒ ایک رات سرکاری کام کر رہے تھے ۔ شمع جل رہی تھی

اور وہ کاغذات کھولے ہوئے اپنے کام میں منہمک تھے کہ ایک دم سے اُن کے دوست آ گئے، السلام علیکم، وعلیکم السلام۔ عمر بن عبد العزیزؒ نے ان سے اس ملک کا حال پوچھا جہاں سے وہ آئے تھے۔ یہ بھی خلافت کا کام تھا اور خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ تمام ممالک محروسہ کے حالات سے واقف ہو، شمع جلتی رہی۔ اتنے میں انہوں نے کہا کہ "کہیے بچے خیریت سے ہیں؟ گھر میں سب آرام ہے، کوئی بیمار تو نہیں ہے؟" حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے فوراً شمع بجھا دی، دوست نے کہا "یہ کیا کیا؟" عمر بن عبد العزیزؒ نے جواب دیا کہ "مسلمانوں کے بیت المال کی شمع اس لئے نہیں ہے کہ عمر کے گھر کے لوگوں کی خیریت پوچھی جائے، ایک ایک آدمی کا نام لے کر اس کا حال پوچھا جائے، اس کے لئے بیت المال کا تیل نہیں ہے، اب جب میں سرکاری کام کروں گا جب جلاؤں گا، اگر میرے گھر کی باتیں آپ کو کرنی ہیں تو میں گھر کی شمع منگواتا ہوں۔" یہ میں نے دو مثالیں آپ کے سامنے دی ہیں ورنہ خلافت راشدہ اور عہد اوّل کی تاریخ میں درجنوں مثالیں ہیں۔

یہ چیز دنیا کے بادشاہوں کو بھی معلوم تھی، قیصر و کسریٰ کو بھی معلوم تھی، قیصر نے اپنی فوج کے کمانڈر سے پوچھا کہ "میں فوج پر فوج بھیجتا ہوں، کمک پر کمک بھیجتا ہوں، آزمودہ کار جنرل جنہوں نے کل ایران کو شکست دی تھی اور اس کے قلب تک پہنچ گئے تھے، ان کو بھی مامور کرتا ہوں، لیکن ہر فوج شکست کھا کر آتی ہے، مجھے بتاؤ کہ یہ آدمی ہیں یا جن؟ یہ کون لوگ ہیں؟" کمانڈر نے کہا کہ "سرکار! اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں صاف صاف بتاؤں!" قیصر نے کہا "ضرور بے تکلف کہو!" اس نے کہا کہ "ان کی حالت یہ ہے کہ رات کو وہ راہب معلوم ہوتے ہیں (اس لئے کہ ان کے یہاں اصطلاح یہی تھی) رات کو تو وہ عبادت گزار نظر آتے ہیں اور دن کو شہسوار۔ رات کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ میدان جنگ سے ان کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ بھی

نہیں جانتے ہیں کہ تلوار کس طرح پکڑی جاتی ہے۔ دن میں ان کو گھوڑوں کی پیٹھ پر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا نام بھی لینے کی ان کو فرصت نہ ہوگی۔ آپ رات کو مسجد چلے جائیں، ان کے قرآن پڑھنے کی دھن میں آپ کان پڑی آواز نہیں سن سکتے، ان کا حال یہ ہے کہ یہ اپنے مفتوحہ علاقہ کی کسی معمولی سے معمولی چیز کو بھی بغیر دام دیئے نہیں لے سکتے۔ اگر ان کے امیر کا لڑکا بھی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹے بغیر نہیں چھوڑتے"۔ قیصر نے کہا کہ "اگر تم نے ان کا حال صحیح صحیح بیان کیا ہے تو میں جہاں بیٹھا ہوں یہاں تک ایک دن ان کی حکومت پہنچ کر رہے گی"۔

حضرات! میں نے جو آیت شروع میں پڑھی تھی اس میں یہی بتایا گیا ہے کہ "الذین ان مکنا ھم فی الارض" یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں قابو دیں گے، ان کے قدم کہیں جمائیں گے، تو یہ نہیں ہوگا کہ یہ عیش و عشرت کریں گے، یہ تعمیرات میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے یہ بڑے سے بڑے سرمائے جمع کریں گے، ان کا تمدن ایک حسین گلدستہ بن جائے گا، ان کے شہروں میں ہن برستا نظر آئے گا، ہر شخص کے سر پر ہما کا پرندہ بیٹھا نظر آئے گا، یہ اعلیٰ سے اعلیٰ سواریوں پر بیٹھے نظر آئیں گے، ان کے دسترخوانوں پر الوان نعمت چنے ہوئے ہوں گے۔ نہیں بلکہ فتوحات کی تاریخ، کشور کشائی کی تاریخ، جنگ آزمائی کی تاریخ اور انسانی حوصلہ اور عزم کے اظہار کی تاریخ کے تجربوں کے برخلاف ان کا حال یہ ہوگا کہ:

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور ○[1]	یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

---

[1] الحج: ۴۱

اگر ہم ان کو زمین میں تمکین واقتدار عطا کریں گے تو نماز کو برپا کریں گے۔ میں اس کا ترجمہ یہ نہیں کرتا کہ نماز پڑھیں گے، لفظ "صَلّوا" نہیں ہے بلکہ "اقاموا الصلاۃ" ہے یعنی نماز کو زندگی کا جزء اور اس کا لازمہ بنادیں گے، اس کا انتظام واہتمام کریں گے اس کے لئے جس فضا کے تیار کرنے کی ضرورت ہے، جتنے علم کی ضرورت ہے، جن جگہوں کی ضرورت ہے (جن کو مساجد کہتے ہیں) ان سب کا اہتمام کریں گے" اقاموا الصلاۃ" "اقاموا" کے لفظ میں یہ سب چیزیں آجاتی ہیں، واتوا الزکاۃ" زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے، زکوٰۃ کو عام کریں گے" وامروا بالمعروف ونہوا عن المنکر اور نیکی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ اس آیت میں بعض دوسری آیتوں کی طرح "امروا" اور "نہوا" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو نصیحت ودعوت یا ترغیب وفہمائش کے الفاظ سے مختلف ہیں امر ونہی (حکم وممانعت) کا منصب ادا کرنے والے کے لئے اس کی کسی قدر طاقت وبالاتری حاصل ہو اور وہ عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو اور اس کی بات نہ ماننے کی صورت میں عقوبت ونقصان کا خوف ہو، اس لئے بھی ایسی جماعت یا امت کو جو اس فرض کو انجام دینے کے لئے پیدا کی گئی ہے، سیاسی اقتدار اور قوت کی ضرورت ہے۔ یہ تھا راز اس واقعہ کی جہانگیری اس واقعہ کی اعجاز نمائی اور اس واقعہ کی بوالعجبی کا جو بعثت نبوی اور امت عربیہ مسلمہ کے ظہور کی شکل میں چھٹی صدی میں پیش آیا۔ یہ وہ چیز تھی جس نے ساری دنیا کو غور کرنے پر مجبور کر دیا اور دنیا کی نگاہیں اسلام کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج بھی دنیا کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک نمونۂ حیات دنیا کے سامنے ہو "حیاۃ" جس کا نام ہے اس کے اندر اضطراب ہے، اس کے اندر اہتزاز ہے، ارتعاش ہے، اس کے اندر جوش بھی ہے، جذبات بھی ہیں۔

اس میں تجارت بھی ہے زراعت بھی، حاکم و محکوم کی تقسیم بھی ہے، عالم و جاہل کا فرق بھی ہے، اس کے اندر بوڑھے بھی ہوتے ہیں جوان بھی، بچے بھی۔ زندگی اپنی تمام بوقلمونیوں کے ساتھ، تمام تنوعات کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایسا ہی ملک جو اس زندگی کا نمونہ ہو اقوام و ملل کی صف میں باعزت مقام حاصل کرسکتا ہے، اگر دنیا کی مدد کرنے کی ضرورت ہو، ذہنی طور پر اخلاقی طور پر تو وہ اس کی بھی صلاحیت رکھتا ہو، وہ ایک آزاد باعزت اور باوقار، طاقتور ملک ہو، ایک وسیع زندگی جس میں وہ سب کچھ ہو جو زندگی کے لوازم ہیں، لیکن وہ ایک صالح باضمیر معاشرہ ایک ایسا ماحول رکھتا ہو جس میں دولت ہی سب کچھ نہیں، اصل چیز اللہ کی رضا، آخرت کا نفع، اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل ہے۔ اس معاشرہ پر تمدن سوار نہ ہو، بلکہ اس معاشرہ نے تمدن کو اپنے زانو کے نیچے رکھا ہو، تمدن اس کا مرکب ہو، اس کا راکب نہ ہو، اس معاشرہ نے زندگی کی آسائشوں کے سامنے سپر نہ ڈالی ہو۔ اس نے زندگی کی آسائشوں کو اپنا تابع بنا رکھا ہو، وہ کسی حدِ شرعی سے کسی وقت تجاوز نہ کرسکتا ہو۔ اس کے یہاں کوئی کسی پر ظلم نہیں کرسکتا۔ اس کے یہاں رشوت کا وجود ہی نہیں ہے، اس کے کسی جج کو کسی طاقت سے غلط فیصلہ پر آمادہ نہیں کیا جاسکتا، اس کے دفاتر میں کام کرنے والے کام چور نہیں ہیں، وہ دیر سے آنے والے نہیں ہیں، وہ ناحق اپنی تنخواہیں وصول کرنے والے نہیں ہیں، وہاں اگر کسی کمزور سے کمزور پر ظلم ہو تو وہ طاقتور سے طاقتور آدمی بن جاتا ہے، اگر کوئی بڑے سے بڑا طاقتور ظلم کرے تو وہ کمزور سے کمزور انسان سمجھا جاتا ہے، جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ "تم میں سے بڑے سے بڑا قوی میرے نزدیک کمزور ہے اگر وہ ظلم کرے گا، اور تم میں سے سب سے زیادہ کمزور طاقتور ہے اگر اس پر ظلم ہو"

یہ وہ آئیڈیل سوسائٹی اور ایسا صالح معاشرہ ہے جس کے لئے دنیا ترس رہی

ہے، تڑپ رہی ہے۔ اس وقت اگر کوئی خدمت انسانیت کی ہو سکتی ہے تو یہی ہے کہ ایک آزاد و طاقتور ملک کی سطح پر آپ اسلامی زندگی کا مظاہرہ کریں۔ یہ وہ چیز ہے جس کے اندر ہزاروں نہیں لاکھوں مقناطیسوں کی کشش ہے جس کے اندر وہ دلربائی وہ جاذبیت ہے جو امریکہ اور روس کو بھی سوچنے پر مجبور کر دے گی۔ ہماری آپ کی سب کی جگہ پیچھے کی صفوں میں ہے اور ہم سینکڑوں چیزوں میں ان کے محتاج ہیں؛ لیکن اگر ہم ایسی زندگی کا نمونہ پیش کریں تو ان کی گردنیں احترام سے ہمارے سامنے جھک جائیں گی۔ وہ اپنے یہاں جرائم کا استیصال نہیں کر سکے، وہ شراب نہیں چھڑا سکے، وہ جوا نہیں چھڑا سکے، وہ ظلم کرنا نہیں بند کر سکے اور آپ کے یہاں یہ سب چیزیں نابید ہیں۔ یہ وہ خدمت ہے جو پاکستان انجام دے سکتا ہے۔

حضرات! مجھے ایک آزاد با اقتدار ملک میں جو کچھ خطرہ محسوس ہوتا ہے وہ نفسانیت سے ہے، جاہ طلبی سے ہے، حکومت اور حصولِ اقتدار کی اس چاٹ سے ہے جو قوموں کو چاٹ چکی ہے اور ان کو کھوکھلا بنا کر رکھ چکی ہے۔ مجھے جو کچھ خطرہ ہے وہ شخصی مفادات سے ہے۔ آپ جانتے ہیں اور اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر زمانہ میں اسلامی مملکت کو جو کچھ نقصان پہنچا وہ مفاد پرستوں سے پہنچا ہے۔ آپ عباسی عہد کی تاریخ پڑھیں ابن العلقمی اور خواجہ نصیر الدین طوسی کا نام آپ کے سامنے آئے گا، جنہوں نے ہلاکو خان کو بغداد پر حملہ کی دعوت دی۔ آپ ہندوستان کی تاریخ پڑھیں گے تو جعفر و صادق کے نام سامنے آئیں گے، جن کے متعلق اقبال نے کہا ہے:[۵]

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

مذہبی اختلاف کو ہوا دے کر، گروہی پروپیگنڈہ کر کے ملک میں اعتقادی یا سیاسی انتشار پیدا کر کے اور اپنا گرویدہ بنا کر جعفر و صادق اس زمانہ میں بھی سامنے آسکتے ہیں،

اور جو کچھ اندیشہ ہے ان ہی جعفرانِ بے ضمیر اور صادقانِ تدبیر سے ہے۔ دوسرا خطرہ وہ سیاسی انتشار ہے جو ملک کے وسیع تر مفادات کو بھول جاتا اور اپنی پارٹی کے مفادات کو سامنے رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر اندیشہ ہے تو صوبائی تعصب اور لسانی تعصب سے ہے کہ زبان کا بھوت کسی صوبے پر سوار ہو جائے اور کسی صوبے کا بت بن جائے اور اس کے سامنے پوری قوم کو سجدہ ریز کرنے اور پوری قوم کو اس کی قربان گاہ پر قربان کر دینے کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ یہ حقیقی خطرات ہیں جو آپ کے ملک کو درپیش ہیں، آپ دنیا کو دکھایئے کہ افراد ہی نہیں، وہ لوگ ہی نہیں جو متروک الدنیا ہیں بلکہ وہ لوگ بھی جن کے پاس طاقت ہے، جن کے پاس وسائل ہیں، جن کے پاس اتنا بڑا وسیع ملک اور مملکت ہے وہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں اور اسلام کی تعلیمات پر اس بدلے ہوئے دور میں، اس عہدِ انقلاب میں بھی عمل ہو سکتا ہے، اسلامی قانون نافذ ہو سکتا ہے اور مملکت کے تمام شہری اس کو دل و جان سے قبول کر سکتے ہیں اس کو کامیاب ثابت کر سکتے ہیں۔ (اسی طرح) علمی بحثیں مدرسوں میں ہونی چاہئیں، تصنیفات میں ہونی چاہئیں، ان کی بنیاد پر ملک کو انتشار اور خانہ جنگی (Civil war) میں مبتلا نہیں کرنا چاہیے۔ آپ اپنی توانائی ضائع نہ کریں۔ میں علماء سے کہوں گا آپ کو یورپ و امریکہ دعوتِ اسلام کے لئے جانا چاہیے۔

تو ہما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مرغ و ماہی

یہ نہ دیکھیے کہ سہرا کس جماعت کے سر بندھتا ہے اور کس جماعت کو کریڈٹ ملتا ہے۔ اس کی فکر کیجیے کہ سر سلامت رہے، اس پر عزت کا تاج کسی ہاتھ سے رکھا جائے۔ مفادِ عامہ کو نظر انداز کر کے جماعتی سطح پر کام نہ کیجیے۔ رضائے الٰہی، حکمتِ دینی، وقت کے تقاضے اور دنیا کے ماحول کے پیشِ نظر خطرات کو سامنے رکھ کر اخلاص و ایثار سے

کام کیجئے اور صرف اللہ سے اجر کے طالب اور امیدوار، اور قوامین للہ شہداء بالقسط (اللہ کے لئے کھڑے ہونے والے اور حق و انصاف کی گواہی دینے والے) بنئے، پھر دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کن انعامات سے سرفراز فرماتا ہے۔

وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم و رسولہ والمؤمنون وستردون الی عالم الغیب والشھادۃ فینبئکم بما کنتم تعملون ○

اور ان سے کہہ دو کہ عمل کئے جاؤ اللہ اور اس کا رسول اور سب مومن تمہارے عملوں کو دیکھ لیں گے اور تم غائب و حاضر کے جاننے والے (اللہ واحد) کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر جو کچھ تم کرتے رہے ہو (سب) تم کو بتا دے گا۔

لہ التوبہ : ۱۰۵

طلبار اور نوجوانوں کی وہ سیرت وکردار جو ملک کی حفاظت وترقی کا ضامن ہے

(کراچی یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبار سے خطاب ۲۶ مئی ۱۹۸۴ء)

حمد وصلاۃ کے بعد!

محترم وائس چانسلر صاحب، اساتذہ، عزیز طلبار اور معززین شہر!

میرے لئے بڑی مسرت اور عزت کی بات ہے کہ مجھے جامعہ کراچی کے اساتذہ اور طلبار اور شہر کے معززین سے خطاب کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ میری حقیر ذات کا جناب وائس چانسلر[1] صاحب نے بڑی فراخ دلی اور کریم النفسی کے ساتھ تعارف کرایا ہے اور میری حقیر علمی کوششوں کو سراہا ہے۔ جس سے خود ان کے مطالعہ کی وسعت اور تنوع کا اندازہ ہوا، لیکن میرے تعارف کا ایک گوشہ رہ گیا، جس سے اس وقت کے حاضرین مجلس کو خاص طور پر دلچسپی ہونی چاہئے۔ وہ یہ کہ میری شعوری اور علمی زندگی کا آغاز معلّمی سے ہوا۔ میرے درجوں کے عزیز طلبار کو کتنا فائدہ پہنچا۔ ان کی کیا خدمت ہوئی؟ اس کے متعلق تو میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا، لیکن مجھے خود بہت فائدہ پہنچا ذہن کی ترقی اور وسعت، انسانی نفسیات کے سمجھنے اور زندگی کے مطالعہ کے سلسلہ میں مجھے اس سے بڑی مدد ملی اور میں نے سکھانے سے زیادہ سیکھا۔ مجھے اپنے طویل سفروں اور دوروں کی وجہ سے مختلف مجالس اور مختلف تقریبات میں بڑے بڑے مجمعوں سے خطاب

---

[1] ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب، جو جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔

کرنے کا موقع ملتا ہے، لیکن میرے لئے خوشگوار ترین موقع وہ ہوتا ہے جہاں مجھے نوجوانوں اور اپنے ہم مشغلہ اساتذہ سے خطاب کرنے کا موقع ملتا ہے۔ آج اللہ نے ایسا ہی موقع مرحمت فرمایا ہے اور میں اس کے لئے جامعہ کے ذمہ داروں کا شکر گزار ہوں۔

حضرات! کسی ملک کی ترقی اور استحکام اور کسی معاشرہ کے تحفظ اور اس کے باعزت زندگی گزارنے کے بہت سے سرچشمے، بہت سی شرطیں اور بہت سی علامتیں ہیں، مثلاً کوئی ملک بڑی فوجی طاقت کا ملک ہے، کسی ملک کے پاس زندگی کے بڑے ذرائع ہیں، کسی کے پاس معدنی، حیوانی، زراعتی دولت کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، کسی ملک میں جامعات کی بڑی کثرت ہے، کسی ملک کے تعلقات عظیم ترین سلطنتوں اور عظیم ترین ملکوں سے بڑے دوستانہ ہیں اور اس ملک کو ان پر بڑا اعتماد ہے، کسی ملک میں انسانی ذہانت کا بڑا ذخیرہ ہے، وہاں بہت انسانی توانائی پائی جاتی ہے۔ وہاں کے لوگ جسمانی طور پر بہت صحت مند ہیں۔ یہ سب چیزیں کسی ملک کی طاقت و استحکام اور کسی ملک کی عزت اور اس کے احترام کی علامتیں سمجھی جاتی ہیں۔ میں ان کا انکار نہیں کرتا، لیکن اگر میرے سامنے کسی ملک کی بڑائی، کسی ملک کے استحکام کا، اور کسی معاشرہ کے باعزت زندگی گزارنے کا ذکر آئے اور کسی ملک کی تعریف کی جارہی ہو تو میں ایک سوال کروں گا، وہ یہ کہ "مجھے یہ بتایئے کہ وہاں کے اسکولوں اور کالجوں سے لے کر یونیورسٹیوں کے طلبا تک نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں کس درجہ کا احساس ذمہ داری پایا جاتا ہے، ان میں ضبط نفس کی کتنی طاقت ہے، ان میں اپنے تاثرات کو حد اعتدال میں رکھنے کی کتنی صلاحیت ہے، ان میں کسی ملک کے صالح نظام اور جائز قوانین کے احترام کی کتنی عادت ہے، اور ان میں احساس شہریت (Civic sense) کتنا پایا جاتا ہے؟" میں تاریخ کے ایک طالبعلم کی حیثیت سے بھی (جس کی طرف وائس چانسلر صاحب نے متعدد اشارے کئے ہیں) اور تاریخ کے حدود سے نکل کر زندہ معاشروں

میں چلنے پھرنے اور لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ایک انسان کی حیثیت سے بھی اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ میں صرف کتابوں کے صفحات اور گزشتہ تاریخ پر اس کی بنیاد نہیں رکھتا، بلکہ اکبر الہ آبادی مرحوم کے اس شعر پر عمل کرتا ہوں ؎

نقشوں کو تم نہ جانچو، لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے

اعداد و شمار کے فن[1] یعنی شماریات نے ہمارے اس زمانہ میں جو اہمیت اختیار کر لی ہے، اس کے لئے جو بڑے عظیم ادارے قائم ہوئے ہیں، ان کے لئے جو انسانی توانائیاں صرف ہو رہی ہیں ان کی اہمیت کو کم کئے بغیر یہ عرض کروں گا کہ میرے نزدیک کسی ملک کے بقا، روار تقار اور اس کی سالمیت اور اس کی عزت و احترام کے جانچنے کا معیار یہ نہیں ہے کہ جو پختہ کار و پختہ سن نسل اس وقت موجود ہے، یا جس نے بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھا ہے، وہ بہتر سے بہتر ہے، اس میں سے ہر شخص ہماری قدیم سوانح کی اصطلاح میں ولی ہے اور علمی اصطلاح میں فاضل اجل علامہ ہے اور دوسری اصطلاحوں میں ان کی جو تعریف کیجئے۔ یہ بالکل کافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ نسل جلد ختم ہو جائے گی۔ اللہ اس کی عمر میں برکت دے لیکن الٰہی قانون اپنا کام کر رہا ہے، اس میں نہ پیغمبروں کا استثنار ہے اور نہ ولیوں کا استثنار ہے، نہ عالموں کا استثنار ہے" وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے ایک رسول ہیں۔ پہلے جتنے رسول آئے چلے گئے) یہ موت و حیات کا قانون سب پر حاوی ہے۔ یہ بات اطمینان کے لئے کافی نہیں کہ کسی ملک کی ادھیڑ یا بوڑھی نسل بڑی پاکباز ہے، بڑی زندہ دل ہے، بڑی صلاحیتوں کی مالک ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جس نسل کو اس نسل کی جگہ لینی ہے اور ملک کی باگ ڈور سنبھالنا ہے اور جس سے اس ملک کی قسمت وابستہ

---

[1] Statistics

ہے، جس سے اس ملک کا تاریخی تسلسل قائم رہے گا، وہ نسل کس درجہ کا اخلاقی معیار رکھتی ہے؟ کس درجہ اس کو اپنی طبیعتوں پر قابو اور کنٹرول ہے؟ کس درجہ اس کے اندر برائیوں سے بچنے کی طاقت ہے اور کس درجہ اس میں مخلصانہ و مردانہ جدوجہد پائی جاتی ہے؟

میرے نزدیک کسی ملک وقوم کی صلاحیت، عزت وطاقت کا یہ اصل معیار ہے، اگر کسی ملک کو سب کچھ حاصل ہے، لیکن اس ملک کے نوجوان اور خاص طور پر تعلیم یافتہ نسل صحیح اور ضروری نظام کا احترام کرنا نہیں جانتی، وہ ملک وملت کے مفاد پر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتی ہے، اس میں اپنے ذاتی مفادات کو ملک کے وسیع تر طویل تر مفادات کے لئے قربان کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو وہ ملک اور قوم سخت خطرہ میں ہے۔ اس لئے کہ اس کی نئی نسل میں قابل تحفظ وقابل احترام روایات کے (جن سے اس ملک کا امتیاز اور اس ملت کا اعزاز ہے) احترام کا جذبہ نہیں پایا جاتا، ضبط نفس کی اس میں عادت نہیں ہے، وہ بارود اور پیٹرول کی طرح ہے، جو فوراً آگ پکڑ لیتے ہیں۔

میں ایک مرتبہ باہر سے یوپی کے مشہور شہر کانپور آرہا تھا، میرے کار کے سامنے ایک ٹینکر چل رہا تھا، بہت دور تک اس کا ساتھ رہا، ہماری کار اس سے آگے نہیں نکل سکتی تھی، اس ٹینکر کی پشت پر لکھا ہوا تھا (Highly Inflammable) اس لئے کہ اس میں پیٹرول بھرا ہوا تھا۔ میں اس کو دیکھتا رہا۔ یہ بے بسی کی بات تھی کہ میری نظر بار بار اس پر پڑتی تھی۔ مجھے کانپور میں دانشوروں اور تعلیم یافتہ دوستوں سے خطاب کرنا تھا۔ میں نے اُن سے یہ واقعہ بیان کیا۔ چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے دانشوروں اور مصنفوں نے بڑے بڑے نتائج نکالے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ادب فلسفہ اور عقلیات کا اتنا ہی حصہ قابل احترام نہیں ہے، جس میں بڑی بڑی علمی تحقیقات کی گئی ہوں بلکہ انسانی نفسیات اور ادبیات کا وہ حصہ بھی بڑا قیمتی ہے، جس میں چھوٹے چھوٹے

واقعات سے بڑے بڑے نتائج نکالے گئے ہیں، میں نے اس مجمع سے (جس میں نوجوانوں کی تعداد خاصی تھی) کہا کہ (Highly Inflammable) پیٹرول کی تعریف ہو سکتی ہے اور جلد آگ پکڑنے والے مادوں کی تعریف ہو سکتی ہے، لیکن ملت اسلامیہ کی یہ تعریف نہیں ہو سکتی، اگر مسلمانوں کے کسی طبقہ کی بھی حالت یہ ہو کہ کسی خلاف طبیعت چیز کو برداشت کرنا ان کے لئے ناممکن ہو اور وہ ہر مسئلہ کو وقار کا مسئلہ بنالیں تو یہ بات بڑی خطرناک ہے۔

یہ[1] واقعہ قوموں اور ملّتوں کی زندگی میں صدیوں میں کبھی کبھی آنا چاہیئے، جب کسی ملت کی اجتماعی توہین ہو، یا شعائر اللہ اور اصول دین کا مذاق اڑایا جائے یا ذاتِ نبوی (علیہ الف الف سلام) کی شان میں معاذ اللہ گستاخی ہو، یا کسی مسلمان کی عزت و آبرو خطرے میں پڑ جائے۔ میں اس کی مثال دیتا ہوں، خلیفہ معتصم اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ دربار میں بیٹھا ہوا ہے، بڑے بڑے فضلاء اور بڑے بڑے ارکان سلطنت موجود ہیں، ایک شخص آ کر کہتا ہے کہ امیر المومنین! میں عموریہ سے آرہا ہوں (عموریہ اسلامی سلطنت سے باہر بازنطینی سلطنت کا ایک شہر تھا، جو ابھی اسلامی قلمرو میں داخل نہیں ہوا تھا) وہاں ایک مسلمان خاتون پر کسی عیسائی نے دست درازی کی، اس خاتون کی زبان سے بے اختیار یہ جملہ نکلا "وامعتصماہ" معتصم کی دہائی ہے! یہ سنتے ہی معتصم نے اس کے جواب میں کہا "لبیك" (میں حاضر ہوں) معتصم اسی وقت وصیت نامہ لکھواتا ہے، اسی وقت اپنی ذاتی چیزوں کے متعلق ہدایات دیتا ہے مجلس سے اٹھتا ہے۔ خود لشکر اسلامی کی قیادت کرتا ہے اور حاکم عموریہ کی گوشمالی، مسلمان خاتون کی دادرسی اور عموریہ کو سلطنت اسلام میں شامل کر کے واپس آتا ہے۔

قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں اگر صدیوں میں کبھی ایسا وقت آئے تو غیرت اسلامی کا

---

[1] جذبات کی اشتعال پذیری کا۔

فتویٰ اور فرمان ہے ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

لیکن افراد کی زندگی میں اگر گروہوں میں ہر روز اور ہر گھڑی یہ وقت آئے اور وہ فوراً اشتعال میں آجائیں اور جاہلیت عرب کے اس شعر پر عمل کریں ؎

لا یسئلون اخاھم حین یندبھم
فی النائبات علٰی ما قال برھانا

شاعر ایک قبیلہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ جب کوئی آواز ان کے کان میں پڑتی ہے قبیلہ کے کسی فرد کی طرف سے، تو وہ دلیل نہیں پوچھتے اور وہ یہ نہیں پوچھتے کہ یہ مقدمہ جائز ہے صحیح ہے یا غلط، اور جس فریق کی مدد کے لئے بلایا جارہا ہے وہ حق پر ہے یا باطل پر؟ وہ فوراً امداد کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں اور فریق ثانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں، لیکن اسلام کی یہ تعلیم نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں فرمایا "انصر اخاك ظالمًا اومظلومًا" (اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے ظالم ہو یا مظلوم) صحابہ کرام کی ایسی ذہنی تربیت ہوئی تھی کہ ان کے ذہن سے غلط چیز کو قبول کرنے کی صلاحیت جاتی رہی تھی، اُن کو ذات نبوی سے جو تعلق تھا، اس کی مثال نہ ادبیات میں ملتی ہے، نہ نفسیات واخلاقیات کی تاریخ میں، نہ سیاسیات میں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ "ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی" (آپ کی زبان سے جو نکلتا ہے، وہ وحی الٰہی ہے) لیکن خود آپ نے ان کی ایسی تربیت کی تھی کہ کسی ایسی چیز کو قبول کرنے کے لئے ان کا ذہن تیار نہیں تھا، جس میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف کوئی بات کہی گئی ہو۔ انہوں نے کہا "یارسول اللہ ننصرہ مظلومًا فکیف ننصرہ ظالمًا؟" (یارسول اللہ اگر وہ مظلوم ہے تو ہم اس کی مدد کریں، اگر ظالم ہو تو کیسے مدد کریں؟) انہوں

نے سوچا آج ہم کیا سن رہے ہیں؟ ہماری قوت سماعت دھوکہ دے رہی ہے، یا ہم معنی نہیں سمجھے؟ آپؐ اس پر بالکل ناراض نہیں ہوئے آپ نے فرمایا! تم نے ٹھیک پوچھا، لیکن ظالم کی بھی مدد ہوتی ہے، ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ لو، اس کو ظلم نہ کرنے دو، اسلام کا اصول یہ ہے کہ مظلوم کی مدد اُسے ظالم سے چھڑانا ہے، ظالم کی مدد مظلوم کی گردن سے اس کا ہاتھ ہٹانا ہے۔

قوموں اور ملکوں کے لئے جہاں بہت سی چیزیں ضروری اور زندگی کی شرطیں ہیں، وہاں یہ بھی ہے کہ ان کے نوجوانوں میں ضبط کا مادہ ہو۔ افسوس ہے کہ ہمارے ادب' ہمارے افسانوں، شاعری (مجھے معاف کیا جائے) پھر ذرائع ابلاغ عامہ، سنسنی خیز صحافت اور اخباروں کی گرم گرم سرخیوں اور مضامین نے جذبات میں جوش اور اشتعال کی ایسی کیفیت پیدا کردی ہے کہ آدمی ادنیٰ درجہ کی خلاف طبع چیز کو برداشت نہیں کرسکتا

میں ابھی چند دن پہلے پٹنہ سے در بھنگہ جا رہا تھا، ایک بڑے اجلاس میں شرکت کے لئے۔ کار جب آگے چلی، تو وہاں کے کچھ سمجھدار لوگ کار کے سامنے آگئے اور کہنے لگے، براہ کرم آپ اس راستہ سے نہ جایئے، میں نے کہا کیا بات ہے۔؟ جہاں پہنچا تھا اس کا وہی راستہ تھا، انہوں نے کہا کہ ایک اسکول کا لڑکا ایک سرکاری بس کے سامنے آگیا، اسے چوٹ آگئی، اس وقت سے اس اسکول کے تمام لڑکے سرکاری بسوں کو جلا رہے ہیں، پرائیویٹ کاروں کو بھی نہیں چھوڑتے، کوئی امتیاز نہیں ہے۔ کوئی کار بھی اس سڑک سے گزرے گی اسے آگ لگادیں گے، ہمارے ساتھیوں نے کہا کہ ہمارے منھ پر داڑھیاں ہیں، مولوی لوگ ہیں اور ظاہر ہے کہ ہم سرکاری لوگ نہیں ہیں' ہمیں کیا خطرہ؟ انہوں نے کہا کہ نہیں اس وقت بالکل سراسیمگی کیفیت ہے، کوئی نہیں دیکھتا کہ کون جا رہا ہے، ہر موٹر جلائی ہے، ہم نے کہا بہت اچھا، ہمارے ساتھ بہار کے ایک بڑے عالم بھی تھے، انہوں نے کہا کہ نہیں مولانا، اس میں بالکل اصرار نہیں

کرنا چاہیے، چنانچہ ہم تقریباً تین گھنٹے لیٹ ہو گئے اور پہلا اجلاس ہمیں نہیں ملا، ہم دن رات دیکھتے ہیں، دو کاروں کی، موٹر سائیکلوں کی ٹکر ہو جاتی ہے، تو ایک ہنگامہ ہو جاتا ہے، ایک فریق اِدھر ہو جاتا ہے دوسرا فریق اُدھر، قانون کو فوراً ہاتھ میں لے لیا جاتا ہے، یہ قانون کو ہاتھ میں لینے کی عادت، جو (مجھے معاف کیا جائے) سیاسی تحریکوں نے پیدا کر دی ہے، یہ بھی ایک بڑا مرض ہے جو وبا کی طرح پھیل گیا ہے۔

کسی ملک کے باقی رہنے کی اور اپنے مقاصد اور اپنی صحیح منزل تک پہنچنے کی ضمانت اس وقت تک نہیں دی جا سکتی، جب تک کہ وہاں کے نوجوانوں میں قوتِ برداشت اور معاملہ کو سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو، کچھ چیزوں کو اپنی مرضی کے خلاف دیکھنے اور گوارا کر لینے کی صلاحیت نہ ہو۔ جن قوموں نے دنیا میں عظیم سلطنتیں قائم کی ہیں (اس سلسلہ میں عربوں کا نام لوں گا، صحابۂ کرام کا اور آخیر میں سلطنت عثمانیہ کا) ان میں یہ وصف نمایاں طریقہ پر موجود تھا۔ میں ترکی گیا تو میں نے دیکھا کہ ترک قوم میں ہماری مشرقی قوموں کے مقابلہ میں قوت برداشت کہیں زیادہ ہے، کہیں میں نے شور ہوتے نہیں دیکھا نظام کا احترام عام ہے، مشتعل ہو کر دنگا فساد کرنے کا کوئی واقعہ کم سے کم میرے سامنے نہیں آیا، یہ بے صبری، جلد بازی، فوراً جوش اور غصہ میں آجانا معاشرے کے مریض ہونے کی علامت ہے۔ اتفاق سے لندن میں مجھے ایک مرتبہ عمومی انتخاب (جنرل الیکشن) کے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ ہر پارٹی کا جو جلوس نکلتا ہے، وہ خاموشی کے ساتھ بینر لگائے ہوئے تھا، جس میں اس کا منشور لکھا ہوا تھا۔ نہ کوئی نعرہ، نہ آواز۔ میں نے کہا کہ ہم نے ہندوستان میں جتنے الیکشن دیکھے ہیں، تقسیم کے پہلے بھی، تقسیم کے بعد بھی، ان میں کوئی سو نہیں سکتا تھا، نماز پڑھنا بھی مشکل تھا۔ ایک پارٹی کا آفس اِدھر قائم ہے، دوسری کا آفس اُدھر قائم ہے اور آوازوں کی طاقت کا مقابلہ ہو رہا ہے کہ کون زیادہ زور سے کہہ سکتا ہے، کس کی آواز بلند ہے، میں نے کہا کہ یہ عجیب

قسم کا الیکشن ہے، میں پولنگ اسٹیشن گیا تو دیکھا کہ ایک صاحبزادی دروازہ پر کھڑی ہیں، انہوں نے ہمارے میزبان کو جو ووٹر تھے، تین پرچے دیئے۔ وہ تینوں پرچے لے کر اندر گئے، جہاں ووٹ ڈالے جاتے ہیں، انہوں نے ووٹ ڈالا اور آکر دو پرچے واپس کر دیئے اور ایک پرچہ رکھ لیا، میں نے کہا یہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا میں نے جس پارٹی کو ووٹ دیا ہے اس کا پرچہ میں نے رکھ لیا ہے، اس لئے وہ سمجھ جائے گی کہ میں نے کس کو ووٹ دیا ہے، نہ میں نے کچھ پوچھا، نہ اس نے کچھ کہا۔ صبح کو میں اٹھا، ٹی وی سے نتائج آنے شروع ہو گئے، تو معلوم ہوا کہ الیکشن ختم ہو گیا۔ فلاں پارٹی جیت گئی، ہم نے انہیں لوگوں سے انتخابی سیاست کا سبق سیکھا تھا، لیکن شاگرد استاد سے بڑھ گیا، ہم نے ان سے سکون، تحمل، ضبط و نظم کا سبق نہیں سیکھا۔

میں اس وقت آپ حضرات کی توجہ ایک تاریخی حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس عظیم جامعہ میں، اس مسئلہ پر کچھ ریسرچ کا کام ہو، میں نے جب برطانیہ کی تاریخ پڑھی، تو معلوم ہوا کہ سترھویں صدی کے اختتام تک برطانیہ کی اخلاقی حالت بہت کمزور تھی اور کوئی علامتیں برطانوی معاشرہ میں ایسی نہیں پائی جاتی تھیں کہ برطانیہ ایک دن ایک عظیم عالمگیر طاقت قرار پائے گا اور ہندوستان جیسی عظیم مملکت پر اس کا قبضہ ہوگا اور بڑی کامیابی اور خوبی کے ساتھ (خواہ ہندوستانی نقطۂ نظر سے وہ استبداد اور ظلم قرار دیا جائے) وہ پورے ملک کو اپنے کنٹرول میں رکھے گا، آپ اگر اس وقت کی شاعری، اس وقت کے افسانے، اس وقت کا لٹریچر پڑھیں اور اس وقت کے اخبارات کے فائل مل جائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس سوسائٹی کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی تھی کہ یہ سوسائٹی اتنا عظیم کردار ادا کرے گی اور ایشیا میں سب سے بڑی طاقت بن جائے گی اور لوگ کہیں گے کہ برطانوی حکومت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا، لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان میں

قدم رکھنے کے بعد جب یہ نظر آنے لگا کہ ہندوستان برطانیہ کی تحویل میں جانے والا ہے اور برطانیہ کے قدم اس ملک میں جم جائیں گے، اچانک برطانوی سوسائٹی میں ایک تبدیلی ہوئی۔ اس کے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا کہ ہم ایک بہت بڑی شہنشاہیت کے مالک بننے والے ہیں، ہمیں رکیک اور پست حرکتوں سے، اپنے ملک سے بے وفائی کرنے سے، اپنی سلطنت کا نام بدنام کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اچانک یہ انقلاب رونما ہوا، میں چونکہ برطانوی تاریخ کا طالبعلم نہیں ہوں، اس لئے پورے وثوق سے اس انقلاب کے سرچشمہ اور اس تبدیلی کے پیدا کرنے والے آدمیوں، تعلیم و تربیت کا کام کرنے والوں اور ذرائع کا تعین نہیں کر سکتا، جو میدان میں آئے اور جنہوں نے برطانوی قوم میں ایک نئی روح پیدا کر دی۔ میرے خیال میں چاہے اس کی کوئی دستاویز نہ ملے مگر اس میں ضرور اس احساس کو دخل تھا، کہ خدا نے ہم کو اتنا بڑا ملک دے دیا ہے، اس لئے اب ہمیں اپنے کو اس کا اہل ثابت کرنا چاہیئے۔ اس انگریزی دور میں، انگریزوں میں ایسا وقار، ایسی تمکنت اور ایسا رعب پیدا ہو گیا تھا، جو آج خود انگلستان میں دیکھنے میں نہیں آتا۔ شہر کے کسی آدمی کو ہمت نہیں تھی کہ قانون کے حدود سے تجاوز کرے۔ اسٹیشنوں پر دیکھتے تھے کہ ہر کام وقت پر ہو رہا ہے، ہر شخص مستعد اور چست ہے، اسکولوں اور کالجوں کا تو کہنا ہی کیا۔ میں اتفاق سے لکھنؤ یونیورسٹی کا طالب علم بھی رہا ہوں۔ یہ ۱۹۲۷ء، ۱۹۲۹ء کا زمانہ تھا، یونیورسٹی میں (اس زمانہ میں وائس چانسلر عام طور پر انگریز ہوا کرتے تھے) ایک عجیب نظم و ضبط نظر آتا تھا۔ نہ کہیں شور سنائی دیتا تھا نہ نعرہ بازی اور مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔

یہ بات اس سے زیادہ وسیع اور عمیق دائرہ میں عربوں کو پیش آئی کہ صحرانشین عرب جب صحرا سے نکلے اور دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں رومۃ الکبریٰ اور سلطنت ساسانیہ کے وارث ہوئے، تو اچانک ان کا ذہن بلند ہو گیا اور جیسا کہ آپ کے پاکستان کے شاعر

اور اسلام کے شاعر مولانا ظفر علی خان مرحوم نے کہا ہے ؎

بات کیا تھی کہ نہ روما سے نہ ایراں سے دبے　　چند بے تربیت اونٹوں کے چرانے والے
جن کو کافور پہ ہوتا تھا نمک کا دھوکہ　　بن گئے خاک کو اکسیر بنانے والے

عربوں کا ذہن ایک دم بلند ہو گیا کہ اب وہ عرب بسوس، داحس و غبرا[1] کا زمانہ نہیں رہا کہ ایک گھوڑے کے آگے بڑھ جانے پر ایک گھوڑے کے پیچھے رہ جانے پر، پہلے پانی بعد میں پانی پینے پر، لڑائی کا سلسلہ چالیس چالیس برس تک جاری رہتا۔ بات کیا تھی آغاز کہاں سے ہوا؟ ایک قبیلہ کے سردار کا گھوڑا پیچھے رہ گیا، ایک کا آگے بڑھ گیا، بس اس نے اپنی توہین سمجھی اور سیکڑوں آدمیوں کی جانیں چلی گئیں۔ انہیں عربوں کو آپ دیکھیں گے کہ سلطنت پانے کے بعد، یعنی جب مسلم امپائر قائم ہوا تو ان کی حالت بالکل دوسری تھی، وہ نہایت متحمل، نہایت اصول پسند، نہایت وسیع النظر اور وسیع القلب بن گئے۔ یہی ہمارے آزاد ہونے والے ممالک میں ہونا چاہئے تھا، مصر میں، شام میں، عراق میں، الجزائر میں اور مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ پاکستان میں۔ ایک دم سے ذہن بدل جانا چاہیئے تھا اور احساس ذمہ داری، احساس فرض اور احترام قانون کی کارفرمائی ہونی چاہئے تھی۔

الف لیلہ کا قصہ ہے کہ کسی شخص نے بغداد کے کسی معزز آدمی کے یہاں اشرفیوں کی ہانڈی امانت رکھی اور کہا کہ میں جہاد پر جا رہا ہوں، معلوم نہیں شہید ہو جاؤں یا زندہ بچ کر آؤں۔ اگر آپ میری شہادت کی خبر سنیں تو فلاں خاندان کے حوالہ کر دیجئے گا۔ ہانڈی رکھ دی گئی، لیکن شہادت ان کے مقدر میں نہ تھی، وہاں سے صحیح سلامت واپس ہوئے تو ان صاحب کے پاس گئے اور کہا کہ "آپ کو یاد ہو گا کہ فلاں موقع پر میں آیا تھا اور میں نے آپ کے پاس ایک ہانڈی امانت رکھی تھی، اس میں اشرفیاں تھیں، اب میں لینے

[1] جاہلیت عرب کی مشہور قبائلی جنگیں، جن میں سیکڑوں آدمی قتل ہوئے اور سالہا سال ان کا سلسلہ چلا۔

آیا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ "آپ کون ہیں، میں پہچانتا نہیں، کچھ اور یاد دلائیے، میرے یہاں تو ایسی کوئی چیزیں نہیں رکھی جاتیں۔ دیکھئے کہیں رکھی ہو تو اٹھا لیجئے۔" وہ بے چارے منہ دیکھتے رہ گئے، کوئی تحریر ان کے پاس تھی نہیں، انہوں نے بہت یاد دلانے کی کوشش کی، کہا کہ شہر میں آپ کی بڑی حیثیت ہے، آپ امانت حوالہ کر دیجئے۔ انہوں نے تجاہل عارفانہ برتا، وہ اپنا سا منہ لے کر چلے گئے۔

وہ قاضی صاحب کے پاس گئے، قاضی صاحب بہت ذہین اور نفسیات سے واقف تھے۔ انہوں نے کہا "تم خاموش رہو، میں ایک ترکیب کرتا ہوں۔ انہوں نے دو چار آدمیوں سے ذکر کیا کہ فلاں صاحب کو فلاں عہدہ ملنے والا ہے، ان کو فلاں جگہ کا صوبہ دار بنایا جانے والا ہے، یا ان کو وزارت ملنے والی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کا چرچا ہو، ایسی کوئی بات راز نہیں رہتی، رفتہ رفتہ صاحب معاملہ نے بھی سُن لیا کہ مجھے فلاں عہدہ ملنے والا ہے۔ یہ مرحلہ طے ہو گیا تو قاضی صاحب نے ان صاحب کو بُلایا اور کہا کہ اب جا کر تم ان سے تقاضہ کرو۔ یاد دلاؤ، ذرا تہذیب سے کہنا کہ شاید اب آپ کو یاد آ گیا ہو۔ وہ صاحب گئے، جیسے ہی صاحب خانہ نے ان کو دور سے دیکھا، کہا آیئے آیئے، اوہو، اتنے دن کہاں رہے؟ آپ نے تو مجھے پتہ بھی نہیں بتایا کہ میں آپ کو بلاتا۔ مجھے یاد آ گیا، وہ فلاں قسم کی فلاں رنگ کی ہانڈی تھی نا؟ وہ وہاں رکھی ہوئی ہے آپ لے لیجئے۔ وہ گئے، جوں کی توں ہانڈی ان کو مل گئی۔ انہوں نے قاضی صاحب سے پوچھا، بات کیا ہوئی ان دونوں میں جوڑ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ بات یہ ہے کہ آدمی کو جب کوئی بڑی چیز مل جاتی ہے تو چھوٹی چیز اس کی نظر سے گر جاتی ہے، جب ان کو معلوم ہوا کہ مجھے اتنا بڑا عہدہ ملنے والا ہے (جاہ، مال سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے) تو انہوں نے کہا کہ کہاں کی ہانڈی، کہاں کی اشرفیاں؟ اس میں میری بدنامی ہوگی، ہو سکتا ہے کہ اس سے اس میں رکاوٹ پڑ جائے، کوئی صاحب خلیفہ سے

جا کر کہدیں کہ امیر المؤمنین! آپ کس کو وزیر بنا رہے ہیں، کس کو آپ صوبہ دار بنا رہے ہیں؟ وہ تو خائن ہے! چور ہے! میری ہانڈی اس نے ہضم کرلی، تو انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ ہانڈی ان کے حوالہ کردی جائے۔

دوستو اور عزیزو! آپ کو اللہ نے اتنی بڑی مملکت عطا کی ہے، اتنا بڑا اعزاز بخشا ہے، خدمت و عزت کے لیے زریں اور نایاب مواقع دیئے ہیں۔ آپ کو اب اس پستی، یہ گراوٹ، اشتعال پذیری، خودغرضی، تنگ نظری، تنگ دلی، قانون شکنی، ایذا رسانی سے بلند ہونا چاہئے جس کو اللہ اتنا بڑا موقع دے، اتنا عظیم ملک اس کی تحویل میں آجائے، وہ ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں پڑے؟ اللہ نے آپ کو انسانیت کی خدمت کا، اسلام کی ترقی اور نام اونچا کرنے کا موقع دیا اور آپ اتنے چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر مشتعل ہوجاتے ہیں؟ لکھنؤ کے محاورہ میں "کچھ آؤ تاؤ نہیں دیکھتے" آپ کے لئے اقبال کا یہ شعر ہے ؎

تو ہما کا ہے شکاری، ابھی ابتدا ہے تیری

نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مرغ و ماہی

آپ مرغ و ماہی کے شکاری نہیں ہیں، آپ ہما کے شکاری ہیں۔ آپ بڑی بڑی قوموں اور ملکوں کے مسئلوں کے حل کرنے کی کوشش کیجئے، ان کو حل کرنے کی صلاحیت پیدا کیجئے۔ آپ کا کام روزمرہ کے شہری معاملات میں الجھنا اور ان میں اپنی طاقت ضائع کرنا نہیں ہے۔ ذرا سی کوئی بات آپ کی مرضی اور معیار کے مطابق نہیں ہوئی کہ آپ بالکل آپے سے باہر ہوجاتے ہیں، یہ مسلم نوجوانوں تعلیم یافتہ نوجوانوں کے شایان شان نہیں۔

میں جناب وائس چانسلر صاحب اور یونیورسٹی کے ذمہ داروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے عزت بخشی اور اپنے عزیز نوجوانوں کو خطاب کرنے کا موقع دیا، اس اعتماد اور حُسنِ ظن کیلئے آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے اس گرم (اور گرم میں ہر لحاظ سے کہتا ہوں) موسم میں میری ٹھنڈی باتیں ٹھنڈے دل اور سکون دماغ کے ساتھ سنیں۔

والسّلام علیکم!

ایک آزاد ملک میں علماء کی ذمہ داری

اور

ان کی مطلوبہ صفات

(وہ تقریر جو جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے اساتذہ و فضلائے شہر اور طلبائے عزیز کے سامنے جامع مسجد بنوری ٹاؤن میں کی گئی)۔

خطبۂ مسنونہ کے بعد!

امابعد! میرے قابل احترام بزرگو، اور قابل محبت بھائیو، اور عزیزو! میں اس وقت ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ میں اپنے گھر میں ہوں اور اس تعارف کے بعد مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی زیدت فیوضہم[۱] نے میرے خاندان کا کرایا اس کے بعد مجھے اور بھی قرب اور موانست محسوس ہوتی ہے، کم از کم درجہ یہ ہے کہ میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عزیز طلباء اور رفقاء کار اساتذہ کے سامنے بیٹھا ہوں اور ان سے باتیں کر رہا ہوں۔ میں بہت شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے ان عزیزوں اور بھائیوں سے باتیں کرنے کا موقع دیا۔ اس کا امکان تھا کہ آپ میری صحت کی رعایت یا میری مشغولیت کے خیال سے مجھے دعوت دینا مناسب نہ سمجھتے، لیکن بہت اچھا ہوا کہ آپ نے یہ زریں موقع مہیا کیا۔

اب میں بغیر کسی معذرت اور تواضع کے کچھ حقیقتیں اور کچھ تقاضے آپ کے سامنے رکھوں گا، جو میں نے اپنے کراچی کے قیام کے چار دن کے مطالعہ اور مشاہدے سے اخذ کئے ہیں۔

---

[۱] مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کے بعد "مفتی اعظم پاکستان" کہے جاتے ہیں۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے باعثِ صد افتخار استاذ مولانا حیدر حسن خان ٹونکی کے پوتے۔

سیاسی اصطلاحات اور سیاسی تصورات اپنی جگہ پر ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ملتِ ہندیہ اسلامیہ کے علمار کی دو شاخیں ہیں۔ ایک شاخ کے لئے تقدیرِ الٰہی نے فیصلہ کیا کہ وہ ہندوستان میں رہے، تاکہ وہاں دعوت اسلامی کا فرض انجام دے۔ اور مسلمانوں کے ملی تشخص کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مشغول رہے، دوسرے حصہ کے لئے قدرت الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ وہ اس ملک میں جہاں پہلے بھی مسلمان داکثریت میں) تھے (بلکہ اسی راستہ سے برصغیر میں آئے تھے) ملت کی تعلیم وتربیت کا فرض انجام دے اور عالم اسلام کے لئے ایک آزاد اور مثالی اسلامی ملک کا نمونہ پیش کرنے میں مدد اور رہنمائی کرے۔

عزیزانِ گرامی! دنیا کے صالح وصحتمند تغیرات وانقلابات اور انسانی عزیمت کی فتوحات کی تاریخ پر اگر کوئی کتاب مستقل طور سے لکھی جائے تو نائبین انبیار اور افرادِ امت کی زبان سے جو جملے نکلے ہیں ان میں ایک جملہ کو سب سے نمایاں اور ممتاز مقام دیا جائے گا اور اس کو آب زر سے لکھا جائے گا۔ یہ جملہ ایسا ہے جس نے حالات کی رفتار کو ایسا بدلا ہے جس کی مثال مِلل وادیان کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ جزیرۃ العرب کے ایک حصہ میں اور بعض قبائل میں ارتداد نے سر اٹھایا۔ یہ نازک ترین مرحلہ تھا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے قریب ہی زمانہ میں اسلام کے قلب وجگر میں ایک شگاف پیدا ہو رہا تھا۔ یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی۔ ابھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے پردہ فرمایا ہے اور اس کو کچھ ہی مہینے گزرے ہیں کہ عرب جن کو ساری دنیا میں اسلام پھیلانا تھا اور جن کو ایک امت مبعوثہ کی طرح اسلام کی دعوت دینی تھی، وہ خود ارتداد کے خطرے سے دوچار ہو رہے ہیں۔ ایسا نازک وقت پوری تاریخ اسلام میں (وفات نبوی کے بعد سے اس وقت تک) نہیں آیا۔ اُس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زبان سے ایک فقرہ نکلا

جس نے تاریخ کا رخ اور واقعات کا دھارا بدل دیا اور خطرہ کا کہرا اس طرح چھٹ گیا جس طرح آفتاب کے نکلنے سے چھٹ جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا (اور تاریخ نے اسی طرح ان الفاظ کو تبرک اور امانت سمجھ کر محفوظ کرلیا ہے) "اَیُنْقَصُ الدین وانا حیٌّ" (کیا دین میں کوئی قطع وبرید ہو سکتی ہے اور میں زندہ ہوں) ابوبکر زندہ ہو اور پھر اللہ اور رسول اللہ کے دین میں کوئی قطع وبرید ہو کوئی کتر بیونت ہو، کوئی انتخاب کا مسئلہ ہو کہ اس رکن کو لیجئے اور اس رکن کو چھوڑیں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسی وقت منع زکوٰۃ کا فتنہ نمودار ہوا تھا، مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا تھا اور ساتھ ساتھ ارتداد پھیلنا شروع ہو گیا تھا چند مقامات کا نام آتا ہے، مثلاً مدینہ طیبہ، جُواثیٰ اور بعض مقامات کا کہ وہاں ارتداد کے اثرات نہیں پھیلے تھے، ورنہ گویا پورا جزیرۃ العرب ارتداد کی لپیٹ میں آرہا تھا، اس وقت اللہ کے ایک بندے نے اپنی زبان سے یہ کہا۔ یہ تو الفاظ ہیں، لیکن الفاظ کے ساتھ جو دلی درد اور جوش تھا، اس کو تو تحریر میں نہیں ادا کیا جا سکتا۔ یہ ان کے دل کی آواز تھی اور ان کے جذبات کا نقطۂ عروج تھا۔ جس طرح سے کوئی جام لبریز ہو جاتا ہے تو چھلک جاتا ہے، زمین پر جو قطرے گرتے ہیں وہ ان الفاظ کی شکل میں ہیں۔

یہ وراثت ہے جو امت کی طرف عمومیت سے اور نائبین رسول اور علماء حقانیین کی طرف خصوصیت سے منتقل ہوئی، یعنی ان کو سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے ہوتے ہوئے کسی ملک میں اسلام کا زوال کسی طرح سے قابل برداشت کیا، قابل تصور بھی نہیں۔ ہم کسی ملک میں موجود ہوں اور وہاں اسلام کا زوال ہو جائے۔ یہ بات ممکن نہیں۔ یہ احساس بنیاد ہے سارے انقلابات اور دینی جدوجہد کی تاریخ کی۔ آپ دعوت و عزیمت کی تاریخ پڑھتے ہیں، امام احمد بن حنبلؒ کے خلق قرآن کے عقیدہ کے خلاف سربکف ہو جاتے ہیں، امام ابوالحسن اشعری کے اعتزال کے مقابلہ میں صف آرا ہو جاتے ہیں۔ امام غزالیؒ کے باطنیت اور مادیت کے مقابلہ اور اسلامی معاشرہ کے مختلف طبقات

وعناصر کے دینی احتساب کے کارنامہ میں، شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے رد روافض میں، بعض کلامی مسائل کی تنقیح کی شکل میں، ہندوستان کے اس ایک تجدیدی کارنامہ میں جو تقریباً چار سو سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے اور جس کے اثرات ابھی تک زندہ ہیں شاہ ولی اللہؒ کی مصلحانہ اور مجددانہ دعوت میں، حضرت سید احمد شہیدؒ اور اکابر دیوبند کے اپنے اپنے وقت میں اور رنگ میں اصلاحی و تربیتی جدوجہد اور اشاعت کتاب و سنت اور عقائد صحیحہ کی سرگرمی میں، یہی احساس کام کر رہا تھا، جس کی ترجمانی صدیقؓ امت نے کی تھی اور ہر دور کے نائبین رسول کو یہ روشنی دکھائی تھی

"وجعلها کلمۃ باقیۃ فی عقبہ لعلھم یرجعون"

اس روشنی میں علماء اپنا احتساب کریں، کہ انہوں نے اس جملہ کو کہاں تک اپنا اصول اور دستور العمل بنایا؟ وہ یہ دیکھیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ان کے ملک میں اسلام یا اسلامی معاشرہ کے زوال کا کوئی جواز ہے؟ مسلمانوں کی پچھلی تاریخ میں ہمارے سامنے بڑی عبرتناک مثالیں ہیں۔ جن ملکوں میں اسلام کا زوال ہوا، یا وہاں دشمنِ اسلام طاقتیں غالب آئیں، آپ اگر تحقیق کریں گے تو ان میں کچھ ایسی چیزیں پائیں گے جن سے اس دور میں سبق لیا جا سکتا ہے۔ ان میں ایک چیز تھی علماء کا شدید اختلاف اور دوسری چیز یہ تھی کہ علماء کا عوام سے رابطہ نہیں تھا، ان کی شخصیتیں اتنی مؤثر نہیں رہ گئی تھیں کہ عوام کے قلوب میں دین کا احترام اور علماء کا وقار قائم رکھتیں۔ وہ ملک جس نے خواجہ بہاء الدین نقشبندی کو پیدا کیا، جس نے خواجہ عبید اللہ احرار کو پیدا کیا، وہ ملک طاقتور روحانی شخصیتوں سے خالی ہو گیا تھا، معیار زندگی بہت بلند ہو گیا تھا، مادیت اپنے عروج پر تھی۔ ابھی تک امیر بخارا کا محل باقی ہے اور کمیونسٹ حکومت اسے دکھاتی ہے کہ دیکھئے کس طرح دولت جمع کی گئی تھی، کس طرح سونے چاندی کے ظروف تھے۔ بقول ان کے عوام بھوکے مر رہے تھے اور امیر بخارا

کے محل میں یہ چیزیں تھیں۔ اسی طریقہ سے آپ اندلس کی تاریخ میں مدینۃ الزھراء اور قلعۃ الحمراء کی تفصیلات پڑھیں، خواب وخیال اور جن وپری کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ وہاں دو بڑے عنصر اسلام کے زوال کا باعث ہوئے ہیں، ایک معیار زندگی کی بلندی اور اللہ کی دی ہوئی دولت کا غلط استعمال اور دوسرے یہ کہ اشاعت اسلام اور معاشرے کو اسلامی بنانے کے بجائے انہوں نے فنون لطیفہ، شعروشاعری اور ادبیات وغیرہ پر ساری توجہ مرکوز کر دی تھی، تیسری بات یہ ہے کہ حاکم خاندان میں حکومت کے لئے رسّہ کشی شروع ہوگئی، سیاسی پارٹیوں کا وہ عہد نہیں ہے، اب اس کی جگہ سیاسی پارٹیوں نے لے لی ہے، یہ تین عنصر تھے، اندلس کے زوال کے۔ (اس پر اضافہ کیجئے اخلاقی زوال کا) آپ اگر "صبح سمرقند" کتاب پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہاں کیا اخلاقی زوال اور انحطاط پیدا ہو گیا تھا۔

میں چند خطروں کی طرف نشاندہی کرتا ہوں۔ بعض مرتبہ باہر سے آنے والا اس چیز کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، جو گھر میں رہنے والا محسوس نہیں کرتا ہے۔ آپ روشنی میں ہیں، اگر کوئی شخص باہر اندھیرے سے آئے گا تو اس کی کیفیت دوسری ہوگی اور بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز ہر وقت دیکھتے رہنے اور سنتے رہنے سے ایسی مانوس ہو جاتی ہے کہ اس میں کوئی جدت نہیں معلوم ہوتی، اس میں کوئی کشش نہیں ہوتی لیکن باہر سے آنے والا اس کو فوراً محسوس کرلے گا۔ مثلاً یہاں اُردو کے سائن بورڈ عام طور پر لگے ہوئے ہیں، آپ کو تو بالکل نہیں محسوس ہوں گے، لیکن ہم ہندوستانی جب یہاں آئیں گے جو انگریزی یا ہندی کے سائن بورڈ دیکھنے کے عادی ہیں، تو وہ ایک خوشی محسوس کریں گے اور کہیں گے کہ ماشاء اللہ یہاں تو ہر طرف اُردو ہی اُردو نظر آتی ہے، ایسے ہی بعض لوگ تختیاں لکھ کر دیواروں پر آویزاں کرتے ہیں، تو ان میں جو چیزیں لکھی ہوتی ہیں آدمی غور سے پڑھتا ہے پھر پڑھنا چھوڑ دیتا ہے، مجھے نہ کسی دُور بینی کا دعویٰ ہے اور نہ دُروں بینی کا، نہ

بصیرت و فراست کا، بقول اقبال ؔ ؎

میں نہ عارف نہ مجدد، نہ محدث، نہ فقیہ　　　مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام

ہاں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر　　　فاش ہے مجھ پہ ضمیر فلک نیلی فام

ہاں میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں باہر سے آرہا ہوں، اس لئے میری بات توجہ کے قابل ہے۔

اپنے اس تاریخی مطالعہ اور عالم اسلام سے قریبی واقفیت کی بنا پر کہتا ہوں کہ اعتقادی اور سیاسی انتشار اس ملک کے لئے سخت خطرناک ہے۔ یہاں مذہبی گروہ ایک دوسرے سے دست وگریباں ہیں۔ بعض بحثیں جو علمی انداز میں ہوسکتی تھیں، ان کو عوام میں لے آیا گیا ہے اور ان کی بنیاد پر متحارب کیمپ اور متوازی محاذ بن گئے ہیں۔ یہ سخت خطرناک بات ہے۔ میں بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتا ہوں جس سے آپ کا تعلق ہے۔ میرے احساسات بالکل وہی ہیں جو آپ کے ہیں اور صرف احساسات نہیں بلکہ ہمارے بزرگوں نے تو وہ جھنڈا بلند کیا جس کی وجہ سے ہم کو نئے نئے لقب ملے اور سخت مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اگر زمین ہی پاؤں کے نیچے سے نکل گئی تو پھر یہ عمارتیں کس پر قائم ہوں گی؟ ایک گروہ یہ ثابت کرنے کی فکر میں ہے کہ پاکستان ہم نے بنایا ہے، دوسرا گروہ ثابت کرتا ہے کہ ہمیں حق پر ہیں اور ہمارا ہی اس ملک پر اقتدار اعلیٰ ہونا چاہیئے۔ اگر ٹٹولا جائے (معاف کیجئے گا میں کسی پر حکم نہیں لگاتا) تو اس کے پیچھے حُب جاہ کا جذبہ نکلے گا۔ ہمارے بزرگوں نے ملک میں دین کو بچانے کے لئے بڑی قربانی دی ہے اور ضرورت پڑی ہے تو اپنی غلطی تسلیم کرلی ہے اور دب گئے ہیں، جھک گئے ہیں اور نیچے اتر آئے ہیں، انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ بھائی آپ ہی اوپر بیٹھئے، مگر دین باقی رہ جائے۔

ہمارے بزرگوں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے مسلک اور ان کے مکتب فکر کے لوگوں کی ہندوستان میں یہی روایت رہی ہے۔ آپ درس کے حلقوں اور علمی مجلسوں میں اختلافی مسائل پر آزادی کے ساتھ گفتگو کیجئے، ان مسائل پر کتابیں لکھئے، مگر ملک کو داؤ پر نہ لگائیے

جب کوئی ایسا محاذ قائم کیا جاتا ہے اور اس طرح کی دعوت دی جاتی ہے جس میں احساس برتری یا اظہار برتری ہوتا ہے، تو اس کے مقابل دوسرا محاذ بن جاتا ہے اور وہاں سے صدائے "ہم چوں من دیگرے نیست" بلند ہونے لگتی ہے۔ ہمارے بزرگوں کا سارا کام تواضع کے ساتھ تھا، اتہام نفس کے ساتھ تھا، "ایمان واحتساب" کے ساتھ تھا۔ نہ ان کو سیادت وقیادت کا دعویٰ تھا اور نہ یہ کہ ہماری جماعت ہی نے سب کچھ کیا ہے اور ہمیں سب کچھ ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکاتیب پڑھئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے مکاتیب پڑھئے، ہندوستان کے اس دور میں جب مسلمانوں کے اقتدار کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور سلطنت مغلیہ دم توڑ رہی تھی، اس وقت انہوں نے احمد شاہ ابدالی، نجیب الدولہ وغیرہ کو جو خطوط لکھے ہیں، ان کو آپ پڑھئے، ان میں کیا درد ہے۔ احمد شاہ ابدالی کو، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ایک مفصل خط لکھا ہے، اس میں بتایا ہے کہ مسلمان اس وقت کس بے بسی کی حالت میں ہیں۔ اس میں انہوں نے کیا مؤثر جملہ لکھا ہے، جس سے ان کی دردمندی اور اخلاص ٹپکتا ہے۔

(میں رسول اللہ کو شفیع بناتا ہوں کہ اللہ کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں پر رحم کیجئے اور ایک مرتبہ آجایئے) چنانچہ احمد شاہ ابدالی انہیں کی دعوت پر آئے اور انہوں نے مرہٹہ طاقت کی ایسی کمر توڑی کہ آج تک وہ پورے طور پر سر نہیں اٹھا سکی۔ یہ شاہ ولی اللہ دہلوی ہی تھے اور ان کا درد تھا، اور ان کی بصیرت تھی جس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا۔ آپ انہیں کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں۔ اس نسبت کا تقاضا ہے کہ ملت اور دین کے لئے جس ایثار و قربانی کی ضرورت ہے وہ پیش کیجئے اور صاف کہئے کہ اچھا بھائی تم ہی صحیح، تمہارا ہی کارنامہ سب سے بڑا ہے، ہم سب مل کر اس ملک کو بچائیں۔ موجودہ خطروں اور اندیشوں میں اس کی کیا گنجائش ہے کہ علماء اس طرح دست و گریباں ہوں۔ یہ بات میں اپنے عقائد کے پورے تحفظ کے

ساتھ کہتا ہوں الحمدللہ ایک شوشہ سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں، نہ عبادات کے مسائل ہیں، نہ اپنے عقائد کے اصول ہیں، کسی چیز میں کسی مفاہمت کے لئے میں تیار نہیں۔ ایک تو اپنا عمل ہے اور ایک یہ کہ اکھاڑا بنا دیا جائے، عوام کو آلۂ کار بنایا جائے اور سارے ملک کو میدان جنگ میں بدل دیا جائے۔ ایک کانفرنس ہو رہی ہے یا رسول اللہ کی اور ایک کانفرنس ہو رہی ہے محمد رسول اللہ کی[۱] یہ جینے کی باتیں نہیں، اس موقع پر اقبال کا شعر مجھے یاد آ رہا ہے ؎

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

دوسری بات یہ ہے کہ عوام کے ساتھ آپ کا رابطہ ہونا چاہئے۔ میں نے محسوس کیا کہ علماء کا عوام سے جو ربط ہونا چاہئے اس میں کمی ہے، بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں علماء کا عوام سے ربط یہاں سے زیادہ ہے۔ وہاں سیاسی میدان میں بھی، علمی ادبی اور تحقیقی میدان میں بھی علماء پیش پیش ہیں اور ان کا مقام تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہاں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ (Intellectual Class) علماء سے متوحش نہیں ہے، ہم ادبی اور علمی مجلسوں میں جاتے ہیں اور الحمدللہ وہاں ہم کو عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے، عوام سے آپ کا ربط بڑھنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ عوام آپ کے ہاتھ سے نکل جائیں۔

تیسری بات جو عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ہماری زندگی عوام کی زندگی سے ممتاز ہو، دیکھنے والا کھلی آنکھوں دیکھے کہ یہ دنیا کے طالب نہیں ہیں، ان کے یہاں مال و دولت معیار نہیں ہے۔ ہمارے کام زیادہ تر حسبۃً للہ ہوں، جیسا کہ ہمارے اسلاف کا طریقہ رہا ہے جب تک ہمارے طبقۂ علماء میں یہ اخلاقی امتیاز نہ ہوگا، ایثار کا مادہ نہ ہوگا، ان کی شخصیت مؤثر اور قابل احترام نہیں ہوگی، دل و دماغ میں دین کا

---

[۱] اس وقت پاکستان میں یہی سننے میں آ رہا تھا۔

گہرا اثر اور وقار نہیں ہوگا۔ علماء کا وقار اس سے نہیں بڑھے گا کہ یہ مدرسہ اتنا بڑا ہے، وہ مدرسہ اتنا بڑا ہے، وہاں اتنے طالبعلم پڑھتے ہیں اور وہاں کے جلسے اتنے کامیاب ہوتے ہیں۔ اس سے علماء کا وقار نہیں قائم ہوگا۔ علماء کا وقار قائم ہوتا ہے ذاتی نمونے سے۔ عوام جب دیکھتے ہیں کہ یہ چیز ایسی ہے کہ اس پر جان دے دی جائے لیکن علماء اس کو ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھتے ہیں، وہ اس کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ہم نے سمجھا ہے کہ دولت سب سے بڑی چیز ہے، ان کے یہاں دولت کی کوئی حقیقت نہیں ہے، جیسا کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے نواب صاحب ڈھاکہ کو جواب دیا تھا۔ نواب صاحب نے کہلوایا کہ آپ مجھ سے مل لیں۔ حضرت نے کہلوایا کہ نواب صاحب سے کہنا کہ آپ کے پاس جو چیز "دولت" ہے وہ میرے پاس بقدر ضرورت موجود ہے، لیکن میرے پاس جو چیز ہے وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس لئے آپ کو آنا چاہئے۔ مجھے آنے کی ضرورت نہیں۔

ایک واقعہ آپ کو اور سنا دوں، بڑا مؤثر ہے۔ شیخ سعید حلبی ایک بزرگ عالم تھے۔ ایک دن دمشق کی ایک مسجد میں سبق پڑھا رہے تھے۔ اس دن ان کے پاؤں میں کچھ تکلیف تھی (یہ واقعہ اگرچہ میرا منہ اس قابل نہیں کہ سنائے لیکن واقعات کے بغیر کام نہیں چلتا چھوٹا آدمی بھی اگر یہ واقعہ سنائے تو اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہے) ہاں تو شیخ سعید درس دے رہے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ مسجد میں جب درس دیا جاتا ہے تو پشت قبلہ کی طرف ہوتی ہے اور سامنے طالبعلم ہوتے ہیں، تو سامنے سے جو آتا ہے، استاد تو دیکھتا ہے طالب علم نہیں دیکھتے، ابراہیم باشا جو محمد علی خدیو، بانی سلطنت خدیویہ کا فرزند تھا اور بڑا جبروت حاکم وسپہ سالار تھا، جس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور جس سے لوگ کانپتے تھے۔ وہ دروازہ کی طرف سے مسجد میں داخل ہوا، حضرت کے پاؤں میں تکلیف تھی اس لئے دروازہ کی طرف پاؤں پھیلائے ہوئے تھے۔ جب وہ قریب آیا تو طالب علموں

آتا ہے کہ آپؐ کی زبان سے کوئی نامناسب لفظ نہیں نکلتا تھا، پہلی مرتبہ اور آخری مرتبہ سخت ترین لفظ جو زبانِ نبوتؐ سے نکلے ہیں وہ ہیں، کوئی شخص تمہارے لئے جاہلیت کا نعرہ لگائے اور خاندان، برادی، قوم کی دہائی دے اور اس کام پر ابھارے تو اس کو اُس کے باپ کی گالی دو، خالی کنایہ سے بھی کام نہ لو، اللہ اکبر! اللہ کے رسول جن کی زبان سے پھول جھڑتے تھے اور شہد ٹپکتا تھا اور قرآن مجید جن کی زبان سے جاری ہوتا تھا "ما ینطق عن الھوی ان ھوالا وحی یوحیٰ" اتنے سخت لفظ بولیں، مجھے یاد نہیں آپؐ نے کسی مسئلہ میں اتنے سخت لفظ استعمال کئے ہوں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ پاکستان کے صوبوں میں جائیں اور خاص طور پر تمام صوبوں کے بچوں کو یہاں بلائیں اور ان کو پڑھائیں اور ان کو ایسا عالم بنائیں کہ خود بخود ان کو اس عصبیت جاہلیہ سے نفرت پیدا ہو جائے، پھر ان کو اس صوبہ میں بھیجیں جس میں یہ لسانی، نسلی، جغرافیائی تعصب پایا جاتا ہے۔ اس جمیت جاہلیہ نے ملکوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کئی اسلامی سلطنتوں کا چراغ گل ہو گیا۔

یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی زبان کا جادو لوگوں کے دل ودماغ پر بٹھا دیں اور اپنی علمی قابلیت کا سکہ جما دیں، لیکن حقیقی احترام عملی نمونہ، سیرت کی بلندی، زہد واستغنار، روحانیت اور اخلاق عالیہ سے پیدا ہوتا ہے۔ علمی وفکری حیثیت سے بھی اخلاقی اور روحانی حیثیت سے بھی مؤثر شخصیتیں پیدا ہونی چاہئیں۔ ہمارے اکابر ایسے تھے، ہمارے اکابر لیسے تھے، ہر وقت اس کی رٹ لگانا اور اس کا وظیفہ پڑھنا کچھ کام نہیں دیتا، میں نے پچھلی مرتبہ یہیں جو تقریر کی تھی اس میں کہا تھا کہ کوئی ملت اور کوئی دعوت تاریخ سے نہیں چلتی، تحریک سے چلتی ہے۔ ہم پاکستان میں دعوت ومسلک، تاریخ سے

چلانا چاہتے ہیں۔ لوگ کہہ دیں گے کہ صاحب سُن چکے، بہت سُن چکے، سنتے سنتے طبیعت بھر گئی، آپ کے اکابر ایسے تھے، ایسے تھے، "پدرم سلطان بود، پدرم سلطان بود" بتایئے آپ کون ہیں؟ کام شروع کیجئے، تاریخ بہت سنائی جا چکی، کتابیں بہت لکھی گئیں، پورا کتب خانہ تیار ہے، اب حرکت اور عمل، جدوجہد، قربانی اور پرکشش و سحر انگیز زندگی کی ضرورت ہے۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

میں متعدد جلیل القدر صحابہؓ جن کا نام احادیث میں آتا ہے، وہاں مقیم ہوگئے تو اس وقت انہوں نے ایک جملہ اسلامی لشکر کو اور وہاں بسنے والے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا تھا، میں اسی جملہ سے آغاز کرتا ہوں، دیواروں پر تختی آویزاں کرنے کا تجربہ کچھ زیادہ ہمت افزا نہیں ہے اس لئے کہ بار بار دیکھنے سے اہمیت جاتی رہتی ہے۔ اکثر اوقات نظر بھی نہیں اٹھتی، اگر امکان ہوتا تو میں کہتا کہ لوحِ دل پر نقش کرلیں، انہوں نے فرمایا کہ اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ "انتم فی رباط دائم لکثرۃ الاعداء حولکم ولتشوف القلوب الیکم" (تم ہمیشہ اس بات کو یاد رکھنا کہ تم محاذ جنگ پر ہو، اور اسلامی سرحد کے محافظ ہو، اس لئے کہ دشمنوں کی نگاہیں تم پر لگی ہوئی ہیں، اور ان کے دل ابھی تمہارے خیال سے خالی نہیں ہوئے)۔ خیال کیجئے کہ مصر فتح ہوگیا ہے، فرعونی سلطنت اور مسیحی آثار مٹا دیے گئے ہیں، ملک میں اسلامی قانون نافذ ہے، تیزی سے مسجدیں بن رہی ہیں، صحابہ کرامؓ آباد ہو رہے ہیں، اسلام میں داخل ہونے کا سلسلہ بھی برابر جاری ہے اور جاری رہے گا، سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ اسلام قبول کر رہے تھے۔ بڑی بات یہ کہ عربی زبان اختیار کر رہے تھے۔ ایسا کم ملکوں میں ہوا کہ وہاں کے باشندوں نے اپنی ترقی یافتہ زبان چھوڑ کر عربی زبان اختیار کرلی ہو، اور پھر قدیم زبان بالکل مٹ گئی ہو۔ یہ بھی صحابہ کرامؓ ہی کی خصوصیت ہے کہ انہوں نے مصر کو فتح کیا تو اس کی زبان عربی ہوگئی، رسم الخط عربی ہوگیا۔ شام کا علاقہ فتح کیا تو اس کی زبان پہلے جو کچھ رہی ہو سریانی یا عبرانی وغیرہ، سب ختم ہوگئی۔ وہاں کے عیسائیوں نے بھی عربی زبان اختیار کرلی اور اس میں کمال پیدا کرنے لگے۔

بہت سے قرآنی الفاظ ایسے ہیں کہ جن کا ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے، رباط کا ترجمہ بھی کسی مفرد لفظ سے کر دینا مشکل ہے، ناکہ بندی، سرحد کی حفاظت، کسی کام میں مسلسل منہمک رہنا، یہ سب رباط کے مفہوم میں آتا ہے، چنانچہ مسجد میں ایک نماز

کے بعد جو دوسری نماز کا انتظار کرتا ہے اس کے لئے بھی فذلکم الرباط فذلکم الرباط کے الفاظ آئے ہیں رباط کے لفظ میں عسکری و جسمانی طور پر اور اس کے ساتھ معنوی ، ذہنی اور فکری طور پر بھی ہمیشہ چوکنا رہنے کا مفہوم آجاتا ہے۔ آپ نے مسلمانوں کو احساس دلایا کہ قدیم آبادی کسی وقت بھی جب اہرام مصر کو دیکھے گی جو فراعنہ نے بنائے تھے، جب وہ اس ملک کی سرسبزی و شادابی دیکھے گی تو اس کو یاد آئے گا کہ کبھی یہاں ہماری سلطنت تھی، تو تم اس سے غافل نہ رہنا ، پھر تم بتیس[۳۲] دانتوں میں ایک زبان ہو۔ سارا براعظم افریقہ (اس وقت شمالی پٹی فتح نہیں ہوئی تھی) پڑا ہوا ہے۔ اس میں ایک مصر ہی ایسا ملک ہے جو اسلام کے قبضہ میں آیا ہے، گویا اس وسیع براعظم میں مصر اسلامی جزیرہ ہے، اس لئے اگر تم ہمیشہ چوکنا نہیں رہوگے تو اس ملک میں اسلام کا محفوظ رہنا مشکوک ہے۔ مسلمانوں کو آزاد مسلم ممالک میں بھی ہمیشہ اس وصیت پر عمل کرنا چاہیئے اور اپنے اندر مرابطانہ کیفیت پیدا کرنی اور قائم رکھنی چاہیئے، کہ وہ ان سب چیزوں سے بچیں جو غفلت پیدا کرنے والی ہیں جو دشمن کو موقع دینے والی ہیں۔

فتنے صرف خارجی نہیں ہوتے، داخلی بھی ہوتے ہیں، اور داخلی فتنے بعض اوقات خارجی فتنوں سے زیادہ خطرناک اور دوررس نتائج رکھتے ہیں۔ مثلاً آپس کا اختلاف آپ سب کو معلوم ہے کہ اسپین کا ملک جو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا، وہ کسی خارجی حملہ سے نہیں نکلا، اس لئے کہ تاریخ میں فرانس کا حملہ کرنا ، یا اس کے ہمسایہ ممالک جرمنی وغیرہ کے حملہ کا کہیں ذکر نہیں آتا، مسلمان اندر سے خود سمٹنے اور بکھرنے لگے تھے ، لیکن حجازیوں ، یمنیوں ، عدنانیوں اور قحطانیوں کی آویزش چچا اور بھتیجے کی تخت و تاج کے لئے نبرد آزمائی اصل فتنہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور فتنہ جو اندلس کے زوال کا باعث ہوا وہ یہ کہ انہوں

نے ساری توجہ تعمیرات اور فنون لطیفہ پر مرکوز کر دی، مدینۃ الزہراء اور قلعہ الحمرا کی زیب و زینت اور نفاست و لطافت خواب و خیال کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

اسی طرح شاعری پر اور ادبی موشگافیوں پر اپنی طاقت مرکوز کر دی۔ خود وہاں کی آبادی کو اسلام سے مانوس کرنے کا کام اور اس کو اسلام کے دائرہ میں لانے کا کام نہیں کیا۔ اس کے علاوہ ہمسایہ ممالک یعنی شمال کی طرف بڑھنے کی طرف ان کی توجہ نہیں ہوئی۔ وہ اپنی سلطنت کو مستحکم کرتے رہے اور اس حقیقت کو بھول گئے جو حضرت عمرو بن العاصؓ کے اس مختصر جملہ میں نظر آتی ہے کہ تمہارے چاروں طرف غیر اسلام کا سمندر پھیلا ہوا ہے۔ اس لئے تمہیں اطمینان نہیں کرنا چاہیئے کہ اس سمندر میں یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ محفوظ رہے گا اور یہاں اس کی موجیں نہیں پہنچیں گی۔ انہوں نے شمال کی طرف بڑھنے کی کوشش نہیں کی، جب ان پر دباؤ پڑا تو وہ جنوب کی طرف ہٹتے چلے گئے، یہاں تک کہ آبنائے جبل الطارق تک پہنچ گئے اور وہاں سے ایک جھٹکے میں وہ مغرب اقصیٰ (مراکش) پہنچ گئے۔

اندرونی کمزوریاں جب کسی ملک میں پیدا ہو جاتی ہیں تو اس کو گھن کی طرح کھاتی ہیں، جیسے دیمک برگد یا املی کے درخت کو چاٹ جاتی ہے، وہ کھڑے رہتے ہیں اور دور سے نظر آتے ہیں۔ پوری پوری باراتیں ان کے نیچے ٹھہرتی ہیں، لیکن دیمک ان ان کو اندر اندر سے چاٹ چکی ہوتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہوا کے ایک جھونکے سے یہ کوہ پیکر درخت زمین پر آ جاتے ہیں۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کی یہ وصیت سارے مسلم ممالک کو چھوٹے ملکوں کو بھی، بڑے ملکوں کو بھی، یہاں تک کہ بلاد مقدسہ جزیرۃ العرب کو بھی حرز جان بنانی چاہیئے کہ "انتم فی رباط دائم" تمہاری پہرہ داری اور تمہاری بیداری کی کوئی حد و نہایت نہیں، تم کبھی اس سے فارغ البال نہ ہونا، کہنے والے نے سچ کہا ہے کہ ؎

مکتب عشق کا دیکھا یہ نرالا دستور
اُس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

حقیقت میں امت اسلامیہ کیلئے چھٹی ہے ہی نہیں، امت اسلامیہ کے سپرد جو کام کیا گیا ہے اسکی جو مشکلات ہیں اس میں چھٹی کا کوئی جواز ہی نہیں، کوئی یہ سمجھے کہ ہم چھٹی پر ہیں یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے، چھٹی کا ایک تو وقت ہوتا ہے اور ایک ذہن ہوتا ہے، چھٹی والی ذہنیت فراغت سے زیادہ خطرناک ہے۔ یعنی یہ تخیل کہ ہم پر اس وقت کوئی بڑی ذمّہ داری نہیں ہے ہم اس وقت کسی ایسے نازک مقام پر کھڑے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ چھٹی منانے، اپنے کو چھٹی پر سمجھنے کی ذہنیت زیادہ خطرناک ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی مہم میں مشغول ہے، لیکن سمجھ رہا ہے کہ یہ محض خانہ پُری ہے، اس کام کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، تو یہ رویہ سخت مضر ہے، تاریخ میں آپ دیکھیں گے کہ جہاں جہاں اسلام کا زوال ہوا ہے وہاں یہ ذہنیت پیدا ہوئی ہے، یعنی راحت پسندی، آرام طلبی، اور محنت سے فائدہ اٹھانے کا مزاج، یعنی محنت ہو چکی اب محنت سے فائدہ اٹھانے کا وقت آیا ہے، صحابہ کرامؓ میں اخیر اخیر تک یہ بات پیدا نہیں ہوئی تھی، ہر وقت وہ تیار رہتے تھے کہ جب ان کو محاذ پر بلایا جائیگا، چلے جائینگے، اور وہاں بھی وہ کروہ محتاط اور بیدار زندگی گذارتے تھے، یہ بعد کی چیز ہے کہ مسلمان قومیں کس طرح مطمئن ہوگئیں۔ اس کو قرآن مجید اخلاد کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے "اخلد الی الارض واتبع ھواہ" کہ زمین سے لگ گیا، اور اپنی خواہش کے پیچھے چل پڑا۔ یہ ذہنیت مسلم اقوام کے لئے سخت خطرناک ہے، ہم نے کام کرلیا، بس آرام کرنے کی ضرورت ہے۔ اپنی محنت سے فائدہ اٹھانے کا وقت ہے۔ مکانات بناؤ بچّوں اور بچیوں کی شادیاں ایسے رئیسانہ طریقہ پر کرو کہ لوگوں پر ثابت ہو کہ خدا نے ہم کو بہت کچھ دیا ہے، پوری عمر محنت کرنے کے لئے نہیں

ہوتی ، اب آرام کا وقت آیا ہے۔ یہ اُمّت اسلامیہ اور کسی ایسے اسلامی ملک کے حق میں جو بیرونی اور اندرونی خطرات سے ہر وقت دوچار ہو سم قاتل ہے، اس کے لئے خودکشی کے مرادف ہے۔

حضرات! میں دیکھ رہا ہوں کہ بے پردگی یہاں بہت عام ہے۔ ہندوستان کے مقابلہ میں پاکستان میں زیادہ بے پردگی ہے، شادیوں میں اسراف بہت زیادہ ہے، معیار اتنا بلند ہوگیا ہے اور شادی کے سلسلہ میں اتنی مشکلات پیدا کر دی گئی ہیں کہ اس سے بہت سی اخلاقی خرابیاں پیدا ہوگئی ہوں گی۔ دولت کا بیجا خرچ ، اپنی عظمت یا اہمیت کا اظہار، معیار زندگی کی روز افزوں ترقی ضروریات کی فہرست میں مسلسل اضافہ اور ان کو ضروری و شرط زندگی سمجھ لینا یہی وہ خرابیاں ہیں جنہوں نے ایرانی و رومی تمدن کو عذاب جاں بنادیا تھا۔ فرش بہار کی تفصیل مولانا شبلی کی "الفاروق" یا مولانا عبدالحلیم شرر کی "تاریخ اسلام" میں پڑھیئے تو معلوم ہوگا کہ ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں، الف لیلیٰ کی کہانی ہے، یہ سب چیزیں تمدن کی غیر معتدل ترقی کا نتیجہ ہوتی ہیں، جو اسلامی اصولوں سے آزاد ہو جائے آپ دیکھیں گے کہ زیادہ تر قوموں کا زوال ان کے تمدن کی خرابی سے ہوا ہے۔ آپ لیکی کی "تاریخ اخلاق یورپ" (HISTORY OF EUROPEON MORALS) کا مطالعہ کریں، آپ دیکھیں گے کہ روم کا تمدن کتنا مسخ ہوگیا تھا، کتنا غیر فطری ہوگیا تھا، اس سے بچنے کی بڑی کوشش کی ضرورت ہے۔

آپ حضرات اللہ کے فضل سے اپنا اپنا حلقہ رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں عملی مثالوں کی سب سے پہلی ضرورت ہے، اور ان عملی نمونوں کے اظہار کی ضرورت ہے۔ "ان تبدوا الصدقٰت فنعما ھی وان تخفوھا وتوتوھا الفقراء فھو خیر لکم" (اگر تم خیرات علانیہ طریقہ پر دو تو وہ خوب ہی ہے اور اگر پوشیدہ دو اور اہل حاجت کو عطا کرو تو تمہارے حق میں بہتر ہے)

لوگوں کے سامنے یہ مثالیں آنی چاہئیں، فلاں بڑے آدمی نے اپنے بیٹے کی شادی ایسی سادگی سے کی، ہمارے یہاں ہندوستان میں ایسی مثالیں ہیں، تقریبات میں طریقۂ سنّت اور اسوۂ صحابہؓ کو زندہ کرنا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ رمضان المبارک کی پوری راتوں کا جاگنا آسان ہے، اور اس میں بڑی لذّت ہے، لیکن ایسی کوئی مثال قائم کرنا اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ آپ روزے رکھوا لیجئے، آپ شب بیداری کروا لیجئے، آپ ہر سال حج کروا لیجئے، ایسے بہت سے بھائی ہیں جو ہر سال حج کو جاتے ہیں، لیکن اگر ان سے یہ کہا جائے کہ ایک لڑکے کی شادی آپ شریعت کے مطابق کر لیجئے، تو نہیں کریں گے۔ یہ کیا ہے؟ یہ نفس کی ایک لذت اور ذائقہ ہے۔ امام غزالی نے جو بڑے حکیم تھے لکھا ہے کہ ایک صاحب اپنے شیخ کے پاس گئے، جن کے وہ معتقد تھے، انہوں نے کہا کہ حضرت! میرا حج کا ارادہ ہے، شیخ جانتے تھے کہ وہ حج کا فرض ادا کر چکے ہیں، انہوں نے کہا حج کو کیوں جا رہے ہو؟ کیا نیت ہے، کیا مقصد ہے؟ انہوں نے کہا ثواب کی نیت ہے! شیخ نے کہا کہ اگر ثواب کا دوسرا راستہ تمہیں بتاؤں تو قبول کروگے؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں؟ ثواب ہی مقصود ہے! شیخ نے کہا دیکھو کئی لڑکیاں ایسی بیٹھی ہوئی ہیں جن کی شادی اس لئے نہیں ہو رہی ہے کہ ان کے ماں باپ کے پاس کچھ نہیں ہے، تم نے حج کے لئے جو رقم معین کی ہے اس میں سے کچھ ان کو دے آؤ، کئی آدمی ایسے ہیں جو اتنے مقروض ہیں کہ غیرت کے مارے گھر سے نہیں نکلتے، تم ان کا قرض ادا کردو، کئی مریض ایسے ہیں جن کے پاس دوا علاج کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ تم ان کو کچھ رقم دے آؤ۔ تھوڑی دیر وہ ٹھہرے کہنے لگے، حضرت حج ہی کا بڑا شوق ہو رہا ہے، حکیم و ماہر نفسیات شیخ نے فرمایا یہ کیوں نہیں کہتے کہ سیاحی کا شوق ہے، ہواخوری کو جی چاہ رہا ہے، اس

زمانہ میں کئی ملکوں میں سے گزر کر جانا پڑتا تھا، یہاں یہ چیز خریدی، وہاں وہ چیز خریدی، سیر کی، پورا قافلہ ہے، اور بڑی دلچسپی کے ساتھ وقت گذر رہا ہے، یہ بہت آسان ہے آپ عبادت کروا لیجئے، ذکر کروا لیجئے، نفلی حج کروا لیجئے۔ لیکن اگر یہ کہیئے کہ سنّت کے مطابق کوئی ایسا کام کیجئے کہ جس سے سب کی نگاہیں اٹھ جائیں اور وہ آپ کی تقلید کریں، تو گریز کیا جاتا ہے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ شاید ان کے پاس پیسہ نہیں رہا، اس لئے یہ ایسا کر رہے ہیں۔ معاشرے کو ان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، معاشرہ بڑی اہم چیز ہے حکومتیں بھی جس زمین پر قائم ہوتی ہیں، وہ زمین معاشرہ کی زمین ہے، اسلامی اخلاق اور اسلامی زندگی کی زمین ہے جب اسلامی معاشرہ نہیں تو پھر کسی چیز کا اعتبار نہیں۔

آپ "انتم فی رباط دائم" کو دستور العمل بنالیں۔ آپ ایک اہم محاذ پر کھڑے ہوئے ہیں کہ آپ کو ہمیشہ چوکنا رہنا چاہیئے، پلک جھپکی اور میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ اس لئے پلک جھپکنے اور سو جانے کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہاں متعدد شخصیتیں ایسی موجود ہیں جو اللہ کے فضل سے ملک کی ممتاز ترین شخصیتیں ہیں، صف اول کے لوگ ہیں۔ وہ بدعات جو عبادات میں شامل ہو گئی ہیں، ان کے خلاف تو اللہ کے فضل سے بہت کام ہوا ہے، ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا، میں اسکی ضرورت کا انکار اور اس کی اہمیت کی تحقیر نہیں کرتا، بغیر اس کو کم کیئے ہمارے معاشرے میں جو بدعات ہیں، جو مغربی بدعات یا ہندوانہ اثرات شامل ہو گئے ہیں ان کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے خطبات، تنظیمی دورے، صحافتی مہم، ریڈیو اور ابلاغ عامہ کے ذرائع سب استعمال کیئے جائیں اور امید ہے کہ اس میں ذمہ دار حلقے بھی آپ کی مدد کریں گے۔ پورے ملک میں معلوم ہو کہ ایک عظیم تحریک چلی ہے، ایک زبردست مہم جاری ہے۔ یہ کام سال دو سال، چار سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت کے لئے جاری

رہنا چاہیئے۔

اللہ تعالےٰ ہمیں توفیق دے اور میں بھی کسی درجہ میں اس کے اجر میں شامل ہو جاؤں۔

والسلام علیکم

○ مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کی خودنوشت سوانح حیات :-

کاروانِ زندگی
(تین ۳ حصّے)

ایک معلّم، مصنّف، مورّخ و داعی کی سرگزشت حیات

جس میں ذاتی زندگی کے مشاہدات و تجربات، احساسات و تاثرات
اور ہندوستان اور عالم اسلام کے واقعات و حوادث
اور تحریکات و شخصیات
کے مطالعہ کا ماحصل
اس طرح گھل مل گیا ہے کہ وہ ایک دلچسپ و سبق آموز "آپ بیتی"
اور ایک مورخانہ و حقیقت پسندانہ "جگ بیتی" بن گئی ہے ــــ اور
چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی کی تاریخ و سرگزشت کا
ایک اہم باب محفوظ ہو گیا ہے
جس سے مورخین بیش قیمت فائدہ اور دینی و علمی کام کرنے والے روشنی
اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں

مجلسِ نشریاتِ اسلام
ناظم آباد ۱ ○ کراچی ۱۸

مفکرِ اسلام مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی چند اہم شاہکار تصنیفات

- تاریخ دعوت و عزیمت مکمل (چھ حصے)
- مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش
- انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
- منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین
- دریائے کابل سے دریائے یرموک تک
- تذکرہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی
- تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات
- تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب
- مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں
- نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں
- جب ایمان کی بہار آئی
- مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت
- حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب
- عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح
- تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک
- مطالعۂ قرآن کے مبادی اصول
- سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا
- خواتین اور دین کی خدمت
- کاروان ایمان و عزیمت
- سوانح مولانا عبد القادر رائے پوری
- نبی رحمت مکمل
- حدیث کا بنیادی کردار
- معرکۂ ایمان و مادیت
- پرانے چراغ مکمل (دو حصے)
- ارکان اربعہ
- نقوش اقبال
- کاروان مدینہ
- قادیانیت
- تعمیر انسانیت
- حدیث پاکستان
- اصلاحیات
- صحبتے با اہل دل
- کاروان زندگی مکمل
- مذہب و تمدن
- دستور حیات
- حیات عبد الحئی
- دو متضاد تصویریں
- تحفۂ پاکستان
- پا جا سراغ زندگی
- عالم عربی کا المیہ

ناشر — فضل ربی ندوی —— فون — ٦١١٨١٧

مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد مینشن ۱۔کے ۳۔ ناظم آباد ۱، کراچی ۱۸